مسئلۂ تملیک

مولانا امین احسن اصلاحی

مسئلۂ تملیک

مسئلۂ تملیک

تصنیف

امین [illegible] احی

المورد

۵۱ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر: المورد

طابع: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

طبع سوم: مارچ 2008ء

قیمت: 50 روپے

ISBN: 978-969-8799-39-7

المورد: K-51 ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 5834306 ,042-5865145

ترتیب

مسئلۂ تملیک

اور

زکوٰۃ سے متعلق بعض دوسرے مسائل

''ترجمان القرآن'' بابت محرم ۱۳۷۴ میں خان محمد صاحب ربانی کا ایک مضمون بعنوان ''حضرات علماے کرام کی خدمت میں چند سوالات'' شائع ہوا تھا۔اس مضمون میں چند ایسے سوال اٹھائے گئے تھے جو ادائیگی زکوٰۃ کے لیے تملیک کو رکن یا شرط قرار دینے کے سبب سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب میں مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کے دو مکتوب ''ترجمان القرآن'' بابت جمادی الاولیٰ ۱۳۷۴ میں شائع ہوئے ہیں۔مولانا ظفر احمد صاحب نے اپنے مکاتیب میں ان اشکالات کا فقہ حنفی کی روشنی میں جواب دینے کی کوشش کی ہے جو ربانی صاحب نے پیش کیے تھے۔ مجھے مولانا کے بعض پیش کردہ نتائج سے اختلاف ہے۔اس وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ اپنا نقطۂ نظر بھی ان صفحات میں پیش کر دوں تاکہ مولانا اور دوسرے اہل علم ان پر غور کر سکیں۔ بحث کی سہولت کے لیے میں پہلے مولانا ظفر احمد صاحب کے خیالات حتی الامکان خود ان کے الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔اس کے بعد اپنی ناچیز معروضات پیش کروں گا۔

تملیک کے متعلق مولانا کا نقطۂ نظر یہ ہے:

''''تملیک فقیر'' زکوٰۃ کے لیے شرط ہی نہیں، بلکہ رکن ہے، بلکہ زکوٰۃ کی حقیقت ہی ''تملیک فقیر'' ہے۔ زکوٰۃ میں تملیک کا ضروری ہونا متفق علیہ ہے۔ کسی امام کا اس میں اختلاف بیان نہیں کیا گیا، بلکہ امام شافعی کی طرف تو یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک 'اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ' میں 'لام' ملک کے لیے ہے۔''

تملیک کو ادائیگی زکوٰۃ کی ایک بنیادی شرط مان لینے کے بعد جہاں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں، وہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر اموال زکوٰۃ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اسے منتقل کرنے کے مصارف بھی زکوٰۃ کی مد سے نہیں ادا کیے جا سکتے، کیونکہ اس میں تملیک فقیر نہیں پائی جاتی۔ جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ زکوٰۃ کی چیزوں کو مد زکوٰۃ کے مصارف سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس کے دو جواب مولانا نے دیے ہیں۔ ایک یہ کہ:

''جس زمانہ میں زکوٰۃ اسلامی حکومت کے ذریعہ سے وصول کی جاتی تھی، اس کی یہ صورت نہ تھی کہ عامل تنہا ہر شخص کے مکان یا چراگاہ پر جاتا اور زکوٰۃ وصول کرتا ہو، بلکہ اس کے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ ہوتا تھا، وہی اس مقام کے تھانہ یا تحصیل میں زکوٰۃ کے مویشی اور اموال جمع کرتے تھے اور اس بستی کے غربا اسی جگہ جمع ہو جاتے اور ان پر زکوٰۃ تقسیم کر دی جاتی تھی۔ جب تک اس مقام پر فقرا موجود ہوتے دوسرے مقام پر زکوٰۃ منتقل نہ ہوتی تھی۔''

مولانا کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی نوبت ہی نہ آتی تھی کہ منتقل کرنے کے مصارف کا سوال پیدا ہو۔ جس کھیت یا کھلیان یا چراگاہ سے زکوٰۃ وصول ہوئی، وہیں غربا و فقرا جمع ہو گئے اور تحصیل داروں نے ان کے اندر زکوٰۃ تقسیم کی اور دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ دوسرا جواب مولانا نے یہ دیا ہے کہ:

''چونکہ ولایت عامہ کی وجہ سے امام فقرا کا وکیل ہوتا تھا اور عمال امام کے نائب ہوتے تھے، اگر فقرا کی مصلحت سے زکوٰۃ کو منتقل کرنے کی ضرورت ہوتی تو امام اور اس کے عمال کو مصارف نقل بھی مال زکوٰۃ سے وصول کرنے کا حق تھا۔ جیسا خود فقیر، مال زکوٰۃ پر قبضہ کر کے اپنے گھر لے

جاتا تو مصارف نفل اسی مال سے نکال سکتا تھا...امام یا مصدق کا مال زکوٰۃ پر قبضہ کرنا فقرا ہی کا قبضہ کرنا ہے، کیونکہ وہ بوجہ ولایت عامہ کے فقرا کا وکیل ہے۔''

مولانا نے ولایت عامہ کا یہ حق صرف ایک ایسی اسلامی حکومت کے لیے تسلیم کیا ہے جو آئین اسلام کے مطابق اسلامی حکومت ہو۔ محض رسمی اور اسمی قسم کی مسلمان حکومتوں کے لیے مولانا یہ حق تسلیم نہیں کرتے کہ وہ ولایت عامہ کی مدعی بن کر مسلمانوں سے عشر وزکوٰۃ کا مطالبہ کر سکیں۔ مولانا کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

''مطالبۂ عشر وزکوٰۃ کا یہ حق اسی حکومت مسلمہ کو حاصل ہے جو آئین اسلام کے مطابق اسلامی حکومت ہو۔ ہر حکومت کو یہ حق حاصل نہیں جو کہ برائے نام ہی اسلامی حکومت ہو اور واقعہ میں اسلامی حکومت نہ ہو۔''

اس اصولی جواب کے بعد مولانا نے خود ہی خاص پاکستان کی حکومت سے متعلق بھی یہ بات صاف کر دی ہے کہ یہ وہ اسلامی حکومت نہیں ہے جو مسلمانوں سے عشر وزکوٰۃ کے مطالبہ کی حق دار ہو۔ خود ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

''یہاں سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ بڑا مقصد اسلامی سلطنت قائم کرنے سے امور دین کا انتظام، احکام شرعیہ کا نفاذ، نماز اور صدقات وزکوٰۃ کا نظم اور شریعت کے موافق مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ کرنا، جہاد اور سامان جہاد کا بندوبست کرنا ہے۔ اگر کسی سلطنت سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا تو وہ اسلامی سلطنت نہ ہو گی اگرچہ مسلمانوں کی سلطنت ہو۔ اور صدقات وزکوٰۃ وصول کرنے کا حق اسی سلطنت کو حاصل ہے جو اس مقصد کو پورا کرے جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، ورنہ اس کو یہ حق حاصل نہیں ہو گا۔ پس جو لوگ اسلامی سلطنت میں سیاست اور مذہب کو الگ کرنا چاہتے ہیں، وہ اسلامی سلطنت قائم نہیں کرنا چاہتے، بلکہ یورپین طرز کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے پاکستان...''

اچھا، اگر پاکستان کی حکومت اس بات کی حق دار نہیں ہے کہ یہاں کے مسلمانوں سے عشر و زکوٰۃ کا مطالبہ کر سکے تو کیا یہاں کے مذہبی اور دینی اداروں اور انجمنوں میں سے کسی کو یہ حق پہنچتا

ہے کہ وہ مسلمانوں سے عشر و زکوٰۃ کی تحصیل کر سکے؟ اس سوال کا جواب مولانا یہ دیتے ہیں:

''عام اداروں کو ولایت عامہ حاصل نہیں، اس لیے ان کو فقرا مجہولین کا قائم مقام نہیں کہہ سکتے، صرف زکوٰۃ دینے والوں کا نائب کہہ سکتے ہیں، کیونکہ وہ تو معلوم ہیں۔ پس ان کے قبضہ کو قبضۂ فقرا نہیں کہا جا سکتا۔ اور ان کے ہاتھ میں زکوٰۃ کی رقم پہنچنے سے زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، جب تک فقرا کے قبضہ میں نہ پہنچ جائے۔ اگر یہ ادارے یا ان کے عاملین زکوٰۃ میں سے سفرخرچ وغیرہ نکالیں گے زکوٰۃ پوری ادا نہ ہوگی، ادھوری ہوگی۔ پس جو ادارے زکوٰۃ کی تحصیل و وصول کے لیے کھڑے ہوں، ان کو ولایت عامہ حاصل کرنا چاہیے۔ جس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ حکومت کی طرف سے ان کو یہ حق دیا جائے یا پھر عامۃ المسلمین باتفاق ان کو یہ حق دے دیں، کیونکہ عامۃ المسلمین بھی حکومت کے قائم مقام ہو جاتے ہیں۔ مگر عامۃ المسلمین کا کسی ادارہ پر اتفاق بہت دشوار ہے۔''

مولانا کے ان ارشادات کی روشنی میں زکوٰۃ کے مصارف اور اس کی وصول و تحصیل سے متعلق جو حقائق سامنے آتے ہیں، وہ بالاجمال مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ زکوٰۃ کی رقم سے غربا کی اجتماعی خدمت و بہبود کا کوئی چھوٹا یا بڑا کام نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً آپ اس سے غریبوں کے محلّہ میں کوئی مسجد نہیں بنا سکتے، ان کے لیے تعلیم دین کا کوئی ادارہ نہیں کھول سکتے، ان کی ذہنی اور فکری تربیت کے لیے کوئی اسلامی لائبریری نہیں قائم کر سکتے، ان کے مریضوں کے مفت علاج کے لیے کوئی شفاخانہ نہیں بنا سکتے، غریبوں کے کسی محلّہ میں اگر کنواں نہیں ہے تو ان کے پانی پینے کے لیے آپ کنواں بھی نہیں بنوا سکتے، مسافروں کے لیے کوئی سرائے یا تالاب بھی نہیں بنا سکتے۔ الغرض اس قسم کا کوئی کام، جو اجتماعی نوعیت رکھتا ہو، خواہ وہ سو فی صدی غریبوں ہی کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو، آپ اس کو زکوٰۃ کی مد سے نہیں کر سکتے۔ کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے شرط ہے کہ کسی معین مستحق زکوٰۃ کو اس کا مالک بنایا جائے۔ مذکورہ صورتوں میں یہ شرط مفقود ہے، کیونکہ ان میں فائدہ بہت سے غریبوں کے درمیان مشترک ہو گیا ہے، اس وجہ سے تملیک نہیں پائی گئی۔

۲۔ آپ اس زکوٰۃ کی رقم سے کسی غریب کی لاش ٹھکانے لگانے کا انتظام بھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ غریب مر جانے کے سبب سے اس قابل تو رہا نہیں کہ اس مال کو اپنے قبضہ میں لے کر اپنے کفن اور دوسرے سامان تجہیز وتدفین کا انتظام کر سکے اور تملیک فقیر کی شرط جو ادائیگی زکوٰۃ کے لیے رکن کی حیثیت رکھتی ہے، پوری ہو سکے، اس وجہ سے زکوٰۃ کی مد سے اس کی تجہیز و تکفین بھی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح آپ کسی مردہ غریب کا قرضہ بھی زکوٰۃ کی رقم سے ادا نہیں کر سکتے اور نہ ہی کسی غلام کو خرید کر آزاد کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ہر چند یہ کام غریبوں کی بڑی خدمت کے ہیں، لیکن تملیک فقیر جو ادائے زکوٰۃ کے لیے شرط ضروری ہے، ان دونوں صورتوں میں بھی مفقود ہے۔[1]

۳۔ کوئی پبلک انجمن یا ادارہ خواہ اس کی دینی حیثیت کتنی ہی مسلم ہو، تحصیل زکوٰۃ کا مجاز نہیں ہے۔ اگر کوئی دینی ادارہ یا انجمن اس کام کو کرے تو وہ وصول کردہ زکوٰۃ میں سے ایک پیسا بھی اس کی وصولی کے مصارف پر خرچ نہیں کر سکتی۔ ورنہ اس کے بقدر زکوٰۃ ادا کرنے والوں کی زکوٰۃ ہی ادا نہ ہوگی۔ اس کے لیے جائز صورت صرف یہ ہے کہ ایک طرف وہ زکوٰۃ دینے والوں سے زکوٰۃ وصول کرے، دوسری طرف غریبوں کو اس کا مالک بناتا جائے۔ یا پھر اگر وہ اس رقم کو غریبوں کی تعلیم یا دوسری ضروریات پر اجتماعی طریقے سے خرچ کرنا چاہے تو پھر اس حیلہ سے کام لے جو عموماً ہمارے مدرسوں میں کیا جاتا ہے، یعنی پہلے زکوٰۃ کسی غریب طالب علم کو دلوائے اور پھر اس طالب علم پر دباؤ ڈال کر اس سے مدرسے یا انجمن کے فنڈ میں وہی رقم بطور عطیہ وصول کر لے۔

۴۔ دینی انجمنوں کے لیے واحد جائز راستہ یہ ہے کہ وہ حکومت سے یا عامۂ مسلمین سے غریبوں کی ولایت عامہ کا حق حاصل کریں۔ لیکن افسوس ہے کہ پاکستان میں اس چیز کے حاصل کرنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے، کیونکہ پاکستان کی حکومت کو، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، خود

---

[1] موخر الذکر چیز کے ناجائز ہونے کی ایک اور وجہ بھی بیان کی جاتی ہے جس پر ہم آگے بحث کریں گے۔

ولایت عامہ حاصل نہیں ہے، تو جو چیز خود اس کو حاصل نہیں ہے، وہ چیز وہ کسی دوسرے کو کس طرح بخش سکتی ہے؟ رہے جمہور مسلمین تو ان کے بارے میں خود مولانا ہی نے بالکل صحیح فرمادیا ہے کہ ان کا کسی ادارہ پر متفق ہونا بہت ہی دشوار ہے۔

۵۔ پاکستان میں ادائیگی زکوٰۃ کی معیاری شکل صرف یہ ہے کہ ہر صاحب زکوٰۃ اپنی زکوٰۃ خود نکالے اور خود کسی مستحق کو تلاش کر کے اس کو اس کا مالک بنادے۔

ان ساری باتوں کی بنیاد فقہ حنفی پر بتائی جاتی ہے اور فقہ حنفی کے متعلق عام تصور (اور خود ہمارا اپنا تصور بھی) یہ ہے کہ وہ اجتماعی اور سیاسی پہلو سے دوسری فقہوں کے مقابل میں عقل سے قریب تر ہے، لیکن زکوٰۃ سے متعلق اس کے ترجمانوں نے یہ تصورات جو دیے ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ ان پر کسی شخص کا قلب بھی پوری طرح مطمئن ہو سکے۔ زکوٰۃ اسلامی معاشرے کے لیے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہے، لیکن اگر یہ واقعہ ہے کہ اس کے ذریعے سے کوئی اجتماعی نوعیت کا کام نہیں کیا جاسکتا اور غریبوں کی مجموعی بہبود کی اسکیمیں اس سے بروے کار نہیں لائی جاسکتیں، بلکہ ختم کی دیگ کی طرح اس کا وہیں تقسیم کر دیا جانا لازمی ہے جہاں یہ پکائی گئی ہے تو اس کی افادیت کم از کم موجودہ زمانہ کے اقتصادی ماحول میں تو بمنزلۂ صفر ہو کے رہ جاتی ہے۔

پھر ایک غور وفکر کرنے والا آدمی یہ سوچ کے بھی حیران رہ جاتا ہے کہ زکوٰۃ کے ذریعہ سے نیکی اور خدمت خلق کے وہ کام بھی انجام نہیں دیے جاسکتے جن میں سے بعض کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے، یہاں تک کہ کسی غریب کی تجہیز وتکفین بھی اس سے عمل میں نہیں آسکتی۔

آگے چل کر اس سے زیادہ حیران کن صورت حال یہ سامنے آتی ہے کہ ایک طرف تو اسلام زکوٰۃ کے معاملہ میں اجتماعیت پر اس درجہ زور دیتا ہے کہ ایک اسلامی حکومت میں کم از کم اموال ظاہرہ کی حد تک کسی شخص کا انفرادی طور پر اپنی زکوٰۃ ادا کرنا سرے سے کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ یا دوسری طرف اسلامی حکومت موجود نہ ہونے کی صورت میں یہ حال ہو جائے کہ ہر شخص کے لیے انفرادی طور پر اپنی زکوٰۃ ادا کرنا ہی ایک معیاری طریقہ رہ جائے اور اعلیٰ کے موجود نہ ہونے کے غصہ میں

اعلیٰ سے قریب تر شکلوں کا اہتمام بھی چھوڑ دیا جائے۔

یہ باتیں ایک عام آدمی کے ذہن میں سخت تشویش اور الجھن پیدا کرتی ہیں۔ بالخصوص یہ چیز تو آدمی کو خود شریعت ہی سے بدگمان کر دیتی ہے کہ صدقات کی رقوم کو کسی عمدہ اجتماعی کام پر صرف کرنے کا اس کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں ہے کہ ایک نہایت بدنما حیلے کی آڑ لی جائے۔ اس وجہ سے نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی جائے۔ اگر فی الواقع دین میں اس کی کوئی بنیاد ہے تو وہ بنیاد معلوم کی جائے جس پر یہ پوری عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ اور اگر یہ ایک بے بنیاد چیز ہے تو اس کی بے حقیقتی واضح کر دی جائے تا کہ بلا وجہ شریعت کے متعلق کسی کے دل میں بدگمانی پیدا نہ ہو۔

تملیک شخصی کے نظریہ کی حقیقت

زکوٰۃ کے مصرف اور اس کی وصولی سے متعلق یہ سارے نظریات درحقیقت فرع ہیں ''تملیک فقیر'' یا بالفاظ دیگر ''تملیک شخصی'' کے نظریہ کی۔ ادائیگی زکوٰۃ کے لیے یہ ضروری قرار دے دیا گیا ہے کہ کسی محتاج اور غریب کو اس کا مالک بنایا جائے، اس قسم کی تملیک کے بغیر زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ اس چیز کو ادائیگی زکوٰۃ کی ضروری شرط، بلکہ رکن زکوٰۃ تسلیم کر لینے سے وہ نتائج آپ سے آپ پیدا ہوتے ہیں جن کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ اس وجہ سے سب سے مقدم یہ ہے کہ معلوم کیا جائے کہ یہ نظریہ کس دلیل شرعی پر قائم ہے۔

اس میں تو شبہ نہیں ہے کہ فقہ حنفی کی کتابوں میں تملیک کا ذکر آتا ہے اور اسی کی بنیاد پر وہ مسائل پیدا ہوئے ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، لیکن مجھے تلاش کے باوجود کہیں اس مسئلہ پر کوئی ایسی بحث نہیں ملی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس کا ماخذ کتاب وسنت کے اندر کیا ہے، کن تقاضوں سے یہ وجود میں آیا ہے اور کب سے اس نے فقہ حنفی کے اندر ایک مسلمہ کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے متعلق اجماع تک کا دعویٰ کیا جانے لگا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شریعت میں کسی چیز کو کسی چیز کا رکن قرار دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کتاب اور سنت کے اندر اس کی کوئی اصل ہو۔ بغیر اس قسم کی کسی اصل کے کسی چیز کو کسی چیز کا رکن قرار دے دینا دین میں ایک اضافہ ہے جس کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا تملیک کے حق میں اس قسم کی کوئی دلیل قرآن یا حدیث سے ملتی ہے؟ اس سوال کے جواب میں، میں یہاں صاحب ''شرح العنایہ علی الہدایہ'' کا ایک نوٹ نقل کرتا ہوں جو انھوں نے صاحب ''ہدایہ'' کے اس دعویٰ کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تملیک رکن زکوٰۃ ہے۔ اس نوٹ سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ یہ نظریہ کتاب وسنت کی کسی دلیل کے اوپر مبنی ہے یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ صاحب ''شرح العنایہ'' فرماتے ہیں:

لان الاصل فی دفع الزکوۃ تملیك فقیر مسلم غیر هاشمی ولا مولاہ جزأ من المال مع قطع منفعة المدفوع عن نفسه مقرونا بالنیة. ولقائل ان یقول قولکم التملیك رکن دعوی مجردۃ اذ لیس فی الادلة النقلیة المنقولة فی هذا الباب مایدل علی ذالك خلا قوله تعالیٰ... اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ ... وانتم جعلتم اللام للعاقبة دون التملیك. والجواب ان معنی قولهم للعاقبة ان المقبوض یصیر ملکالهم فی العاقبة فهم مصارف ابتداً لا مستحقون ثم	''کیونکہ ادائیگی زکوٰۃ کے لیے اصلی چیز یہ ہے کہ آدمی اپنے مال کے کچھ حصہ کا کسی مسلمان محتاج کو، جو ہاشمی یا کسی ہاشمی کا آزاد کردہ غلام نہ ہو، ادائیگی زکوٰۃ کی نیت کے ساتھ اس طرح مالک بنا دے کہ خود اپنی کوئی غرض اس ادا کردہ مال کے ساتھ وابستہ نہ رکھے۔ ایک معترض اس پر یہ کہہ سکتا ہے کہ تمھارا یہ کہنا کہ تملیک ادائیگی زکوٰۃ کے لیے رکن کی حیثیت رکھتی ہے محض ایک خالی خولی دعویٰ ہے، کیونکہ زکوٰۃ کے سلسلہ میں جو نقلی دلیلیں وارد ہیں، ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی جس سے اس دعویٰ کا ثبوت مہیا ہوتا ہو۔ لے دے کر اس باب میں جو چیز دلیل کی حیثیت رکھتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے

يحصل لهم الملك فی العاقبة بدلالة اللام فلم تبق دعوی مجردة. (حاشیہ فتح القدیر۲/۲۰)

کہ 'اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ'، لیکن اس کا حال بھی یہ ہے کہ تم (یعنی حنفیہ) 'لِلۡفُقَرَآءِ' کے ''لام'' کو ''عاقبت'' کے معنی میں لیتے ہو، تملیک کے معنی میں نہیں لیتے۔ جواب اس اعتراض کا یہ ہے کہ لام کو جو ہم ''عاقبت'' کے معنی میں لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مقبوضہ مال آخر کار ان کی ملک بن جائے گا۔ پس اپنی ابتدائی حیثیت میں تو یہاں فقرا اور مساکین کا ذکر مصارف زکوٰۃ بیان کرنے کے پہلو سے ہوا ہے، مستحقین کی حیثیت سے نہیں ہوا ہے، لیکن لام اس بات پر دلیل ہے کہ بالآخر ان کو ملکیت حاصل ہو جائے گی۔ پس تملیک کا دعویٰ محض دعویٰ ہی دعویٰ نہیں رہا۔''

اس نوٹ کو بغور پڑھیے۔ یہ ایک ایسے بلند مرتبہ حنفی عالم کے قلم سے نکلا ہے جنھوں نے ''ہدایہ'' جیسی بلند پایہ کتاب پر حاشیہ لکھا ہے۔ ان کے اپنے اعتراف سے یہ بات نکلتی ہے کہ تملیک کے رکن زکوٰۃ ہونے کی کوئی نقلی دلیل موجود نہیں ہے۔ لے دے کر اگر کسی چیز کو دلیل کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے تو وہ ایک لام ہے جو 'اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ' والی آیت میں لفظ 'فُقَرَآءِ' پر داخل ہے۔ اس ''لام'' کا بھی حال یہ ہے کہ احناف اس کو غالباً شوافع کے استدلال سے بچنے کے لیے تملیک یا استحقاق کے معنی میں نہیں لیتے، بلکہ ''عاقبت'' کے معنی میں لیتے ہیں[۲]۔ اول تو اس ''لام''

۲؎ اس لام پر مفصل بحث آگے آ رہی ہے، وہیں اس کے بارے میں احناف اور دوسرے ائمہ کے مذاہب پر ہم روشنی ڈالیں گے۔

کو ''عاقبت'' کے معنی میں لینے کا کوئی تک نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس معنی میں اس کو لے بھی تو بہر حال اس سے تملیک کا مفہوم تو کسی طرح بھی نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ اگر بہت تکلف سے کام لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں لام کو عاقبت کے معنی میں لینے کے بعد بھی یہ آیت تملیک کے مفہوم کے خلاف نہیں جاتی اور یہی ان بزرگ عالم نے فرمایا بھی ہے، لیکن اتنی بات کچھ بھی مفید مطلب نہیں ہے۔ اصلی سوال تو یہ ہے کہ تملیک کے رکن زکوٰۃ ہونے کی کتاب و سنت سے کوئی دلیل ہے یا نہیں؟ اگر اس کی کوئی دلیل موجود ہے تو ہم بڑے شوق سے یہ مان لیں گے کہ اس ''لام'' کو ''عاقبت'' کے معنی میں لینے سے بھی کوئی خاص حرج واقع نہیں ہوتا، لیکن اگر اصل دعویٰ ثابت نہ ہو تو محض لام عاقبت کی اس توجیہ سے اصل بحث کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ تملیک کا دعویٰ تو اس توجیہ کے بعد بھی محض دعویٰ ہی دعویٰ رہا۔

لام تملیک سے استدلال کی حقیقت

حنفیہ اگرچہ 'اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ' والی آیت میں لام کو تملیک کے معنی میں نہیں لیتے، اس وجہ سے ان کے ہاں تملیک پر استدلال کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، لیکن یہ لام بہر حال ایک بنائے بحث بن سکتا ہے اور اس سے ایک شخص تملیک پر استدلال کر سکتا ہے جیسا کہ امام شافعی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس سے تملیک پر استدلال کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ ''لام'' تملیک کے مفہوم کے لیے ایسا نص قطعی ہے کہ تملیک کو ادائے زکوٰۃ کے لیے ایک رکن کی حیثیت دے دی جائے جس کے بغیر زکوٰۃ ادا ہی نہ ہو سکے اور اس کے نتیجہ میں وہ سارے مسائل پیدا کر ڈالے جائیں جن کا صدر مضمون میں ہم نے حوالہ دیا ہے اور جن کے سبب سے زکوٰۃ جیسی اہم چیز کی ساری افادیت بالکل ختم ہو کے رہ جاتی ہے۔

میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اس ''لام'' کو تملیک کے مفہوم کے لیے خاص کر دینا ایک نہایت کمزور بات ہے۔ عربی زبان میں یہ حرف کچھ ایک ہی معنی کے لیے نہیں آتا کہ اس سے حاصل شدہ مفہوم کو شرط اور رکن کا مرتبہ دے دیا جائے۔ حروف کی بحث میں آٹھویں صدی ہجری کے مشہور نحوی شیخ

جمال الدین ابن ہشام انصاری کی ''مغنی اللبیب'' ایک مستند ترین کتاب ہے۔اس فاضل نے یہ کتاب لکھی ہی اس غرض سے ہے کہ یہ قرآن وحدیث کی نحوی مشکلات کے حل کرنے میں رہنمائی کر سکے۔انھوں نے ''لام'' کے متعلق یہ لکھا ہے کہ یہ ۲۲ معنوں کے لیے آتا ہے۔ان تمام معانی کی تفصیل نقل کرنا تو یہاں مشکل بھی ہے اور غیر ضروری بھی،لیکن اس کے چند معانی کتاب مذکور سے ہم یہاں درج کرتے ہیں تاکہ اس کی وسعت کا اندازہ ہو سکے اور جو لوگ اس کو تملیک کے معنی کے لیے ایک نص قطعی بتا رہے ہیں،ان کی غلطی واضح ہو سکے۔علامہ موصوف نے اس حرف کے جو معانی بتائے ہیں،ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔استحقاق کے معنی کے لیے،مثلاً 'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ' (شکر حقیقی کا حق دار اللہ ہی ہے)۔'وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ' (ماپ تول میں کمی کرنے والے ویل کے مستحق ہیں)۔

۲۔اختصاص کے معنی کے لیے،مثلاً 'اَلْجَنَّةُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ' (جنت اہل ایمان کے لیے خاص ہے)۔

۳۔ملکیت کے مفہوم کے لیے،مثلاً 'لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ' (اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے)۔

۴۔تملیک کے معنی کے لیے،مثلاً 'وَهَبْتُ لِزَیْدٍ دِیْنَارًا' (میں نے زید کو ایک دینار ہبہ کر دیا)۔

۵۔تملیک سے ملتے جلتے مفہوم کے لیے،مثلاً 'جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا' (اور تمھاری ہی جنس سے تمھارے لیے بیویاں بنائیں)۔

اوپر ضمناً ''لام عاقبت'' بھی زیر بحث آچکا ہے،اس وجہ سے اس کی نوعیت بھی معلوم کر لیجیے۔ سترھویں نمبر پر اس کا ذکر اس طرح آتا ہے کہ 'لام صیرورة' جس کو 'لام عاقبت' اور 'لام مآل' بھی کہتے ہیں،مثلاً 'فَالْتَقَطَهٗ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِیَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا' (اور اس (موسیٰ کو) فرعون کے گھر والوں نے دریا سے نکال لیا تاکہ ان کے لیے دشمن اور غم کا کانٹا بنے)۔

یہ لام جر کے ۲۲ معنوں میں سے ہم نے صرف چند کا حوالہ دیا ہے،اس سے اس کی وسعت کا

اندازہ کیجیے۔ اور ساتھ ہی یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ صاحب ''مغنی اللبیب'' حتی الوسع ہر مفہوم کی مثالیں قرآن وسنت سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن تملیک کے مفہوم کی وضاحت کے لیے انھوں نے قرآن کی کوئی مثال دینے کے بجائے عربی زبان کا ایک عام فقرہ 'وَهَبْتُ لِزَيْدٍ دِيْنَارًا' نقل کر دیا ہے۔ اگر آیت 'اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ' کی ''لام'' تملیک کے مفہوم کے لیے کوئی واضح اور قطعی چیز ہوتی تو ابن ہشام کے ذوق کے یہ بات بالکل خلاف تھی کہ وہ قرآن کی ایک مثال نظر انداز کر کے ایک کم تر درجہ کی مثال پیش کرتے۔

بہرحال تملیک کے نظریہ کی عمارت اگر 'لِلْفُقَرَآءِ' کی لام ہی پر کھڑی ہے تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ بنیاد نہایت کمزور ہے۔ اول تو اس کے مفہوم ہی کے بارہ میں بڑے اختلافات ہیں۔ احناف اس کو لام عاقبت کے معنی میں لیتے ہیں، جیسا کہ شارح ''ہدایہ'' کے اس نوٹ سے مترشح ہوتا ہے جس کا اوپر ہم نے حوالہ دیا ہے، مالکیہ اس کو لام اجل کے مفہوم میں لیتے ہیں، جیسا کہ قاضی ابن عربی نے ''احکام القرآن'' میں بتصریح لکھا ہے۔ صرف امام شافعی کے متعلق یہ تصریح ملتی ہے کہ وہ اس کو تملیک کے معنی میں لیتے ہیں۔ ثانیاً، اگر یہ اختلاف نہ بھی ہوتا، جب بھی زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ آیت میں تملیک کے مفہوم کی بھی گنجایش نکلتی ہے۔ اور اس کی حیثیت محض ایک استنباط کی ہوتی، نہ کہ ایک نص قطعی کی جس کی بنا پر تملیک کو اداے زکوٰۃ کے لیے رکن یا شرط لازم قرار دے دیا جائے۔

میرے نزدیک یہاں لام تو استحقاق واختصاص کے مفہوم کے لیے ہے یا انتفاع وافادہ کے مفہوم کے لیے، تملیک کے لیے ہرگز نہیں ہے۔ سیاق وسباق کلام اس مفہوم سے ابا کرتا ہے۔

سب سے پہلے نظم کلام کی روشنی میں اس مسئلہ پر غور کیجیے۔ 'اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ' والی آیت جس سیاق وسباق میں ہے، وہ یہ ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ.	''اور ان منافقین میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو تمھیں صدقات کی تقسیم کے بارہ میں متہم کرتے ہیں۔ اگر اس میں سے انھیں بھی

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ. اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ.

(التوبہ۹: ۵۸-۶۰)

ان کی خواہش کے بقدر دیا جائے تو راضی رہتے ہیں اور اگر نہ دیا جائے تو بگڑ بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ اس پر قناعت کرتے جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو دیا اور کہتے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے، اللہ اپنے فضل سے ہمیں نوازے گا اور اس کا رسول بھی ہمیں عطا فرمائے گا، ہم تو اللہ ہی سے لو لگائے ہوئے ہیں تو یہ بات ان کے حق میں بہتر ہوتی۔ خیرات کا مال تو بس فقیروں کا حق ہے اور محتاجوں کا اور ان کارکنوں کا جو مال خیرات کے وصول کرنے پر تعینات ہیں اور ان لوگوں کا جن کے دلوں کا پرچانا منظور ہے۔ نیز گردنیں چھڑانے میں اور زیر باروں کے قرضہ میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کی ضروریات میں اس کو خرچ کیا جائے۔ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا فریضہ ہے اور اللہ علم و حکمت والا ہے۔''

دیکھیے، یہاں اوپر والی آیت میں ذکر ان منافقین کا تھا جن کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسن ظن اور سوء ظن تمام تر اغراض پر مبنی تھا۔ اگر خیرات کے مال میں سے ان کی خواہش کے بقدر انھیں مل جاتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خوب خوب تعریفیں کرتے اور خواہش کے بقدر نہ ملتا تو آپ کو متہم کرنے سے بھی باز نہ رہتے۔ آپ پر بے جا جانب داری اور ناروا پاس داری کا الزام لگاتے اور لوگوں میں طرح طرح کی وسوسہ اندازیاں کرتے پھرتے۔ غور کیجیے کہ اس سیاق میں بتانے کی

بات کیا ہو سکتی ہے، یہ کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے کسی فقیر کو اس کا مالک بنانا ضروری ہے یا یہ کہ زکوٰۃ و خیرات کی رقموں کے اصلی حق دار اور مستحق فلاں فلاں قسم کے لوگ ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سیاق میں بتانے کی بات یہ دوسری ہی ہو سکتی ہے نہ کہ پہلی۔ چنانچہ مفسرین میں سے جن لوگوں کی نظر سیاق و سباق پر رہتی ہے، انھوں نے آیت کی یہی تاویل کی بھی ہے۔ صاحب ''کشاف'' 'اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ' کی تاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قصر لجنس الصدقات علی الاصناف المعدودة وانها مختصة بها لا تتجاوزها الی غیرها کانه قیل انما ھی لھم لا لغیرھم ونحوه قولك انما الخلافة لقریش ترید لا تتعداھم ولا تکون لغیرھم.
(الکشاف ۲/۲۶۹)

''یہاں صدقات و زکوٰۃ کو مذکورہ اقسام پر محدود کر دیا گیا ہے اور یہ کہ یہ انھی کے لیے خاص ہے۔ دوسروں کی طرف یہ چیز منتقل نہیں ہو سکتی۔ گویا یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ چیز انھی کے لیے ہے، ان کے ماسوا لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ تم کہو: 'اِنَّمَا الۡخِلَافَةُ لِقُرَیۡشٍ' (خلافت تو بس قریش کے لیے ہے) یعنی یہ ان کے سوا دوسروں کا حق نہیں ہے۔''

پس لام یہاں جس چیز کو ظاہر کر رہا ہے، وہ صرف خیرات و صدقات کا مذکورہ اصناف کے لیے خاص ہونا ظاہر کر رہا ہے، نہ تملیک کے معاملہ سے اس کو کوئی تعلق ہے اور نہ اس مسئلہ سے اس کو کوئی واسطہ ہے کہ یہ تمام اصناف بیک وقت اس کی حق دار ہیں یا ان میں سے مصلحت کے تحت کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جا سکتی ہے یا ان میں سے کسی ایک ہی کو اس کا مصرف بنایا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد آیت کی اندرونی تالیف پر غور کر کے دیکھیے کہ خود اس کے مختلف اجزا کی باہمی مناسبت کا تقاضا کیا ہے۔ آیت کے اندر، جیسا کہ بالکل واضح ہے، آٹھ اصناف کا بحیثیت مصارف خیر کے ذکر ہے، جن میں سے ابتدائی چار کا ذکر 'لام' کے تحت ہے اور چار کا ذکر 'فی' کے تحت۔ ظاہر ہے کہ کلام میں یہاں کوئی ایسی ہی تقدیر ماننا مناسب ہوگا جو 'لام' کے ساتھ بھی مربوط ہو سکے اور

'فی' کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو سکے۔ اگر ''لام'' کو تملیک کے معنی میں لیجیے تو آیت کا ابتدائی حصہ اس کے آخری حصہ سے بالکل ہی بے ربط ہو کے رہ جائے گا، کیونکہ 'فی' میں بہرحال تملیکیت کا کوئی مفہوم نہیں پایا جاتا۔ اگر اس کے اندر پایا جاتا ہے تو افادیت اور خدمت و مصلحت کا مفہوم پایا جاتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے: 'مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ' (جب تک کہ ایک مسلمان اپنے بھائی کے کام میں یا اس کے مصالح کی خدمت میں رہتا ہے)۔ پس آیت کے دونوں حصوں کی ہم آہنگی کا اقتضا یہ ہے کہ یہاں لام کو استحقاق یا انتفاع کے مفہوم میں لیا جائے تا کہ ایک ہی تقدیر کے تحت پوری آیت کی تاویل ہو سکے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا، بلکہ ''لام'' میں تملیک کا مفہوم لیا گیا تو آخری چار اصناف کے ساتھ تملیکیت کا مفہوم جوڑنے کے لیے کلام کی وسعت اور اس کی بلاغت کو بالکل ذبح کر دینا پڑے گا جیسا کہ فی الواقع کیا بھی گیا ہے اور جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اس ادبی نکتہ کی طرف ابن منیر نے ''کشاف'' کے حاشیہ ''الانتصاف'' میں توجہ دلائی ہے:

فاما ان یکون التقدیر انما الصدقات مصروفة للفقرآء کقول مالك او مملوکة للفقراء کقول الشافعی لکن الاول متعین لانه تقدیر یکتفی به فی الحرفین.
(الانتصاف حاشیہ کشاف ۲/۲۸۳)

''اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ' میں تقدیر کلام یا تو یہ ہوگی کہ صدقات فقرا کے لیے صرف کیے جائیں گے، جیسا کہ امام مالک کہتے ہیں یا یہ ہوگی کہ صدقات للفقراء کی ملکیت ہیں، جیسا کہ امام شافعی کا قول ہے۔ لیکن یہاں پہلی تقدیر متعین ہو جاتی ہے، کیونکہ یہ دونوں حرفوں ('ل' اور 'فی') کے ساتھ یکساں طور پر ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔''

تملیک کی بعض دوسری دلیلیں

اس ''لام'' کے علاوہ مجھے فقہ کی مشہور اور متداول کتابوں میں تملیک کے رکن زکوٰۃ ہونے کی

کوئی دلیل باوجود تلاش کے نہیں ملی اور اگر ملی بھی ہے تو اس کا تملیک کی دلیل ہونا کم از کم اس عاجز پر کسی پہلو سے بھی واضح نہیں ہوسکا۔ تاہم چونکہ اسی طرح کی بعض مبہم چیزوں کو بطور دلیل پیش کیا گیا ہے، اس وجہ سے میں ان پر بھی ایک تنقیدی نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے ''بدائع الصنائع'' کے حوالہ سے تملیک کی مندرجہ ذیل دلیل اپنے مضمون میں نقل فرمائی ہے:

وقد امر اللّٰه تعالیٰ الملاك بايتاء الزكوٰة لقوله عزوجل و اٰتوا الزكوٰة والايتاء هو التمليك ولذا سمى اللّٰه تعالى الزكوٰة صدقة بقوله عزوجل اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ والتصدق تمليك. (۳۹/۲)	''اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم 'وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ' کے ذریعہ سے مالکین نصاب کو زکوٰۃ کا حکم دیا ہے اور 'ایتاء' تملیک ہی ہے۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا نام صدقہ رکھا ہے۔ ارشاد ہے: 'اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ' اور تصدیق وہی تملیک ہے۔''

دوسری جگہ ہے:

واما ركنه فهو التمليك لقوله تعالیٰ واتوا حقه يوم حصاده والايتاء هو التمليك. (بدائع الصنائع ۶۴/۲۔۶۵)	''رہا زکوٰۃ کا رکن تو وہ تملیک ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: 'وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ' (اور اس کی کٹائی کے وقت اس کا حق دو) یہاں 'ایتاء' سے مقصود ہی تملیک ہے۔''

تملیک کی تائید میں جن نصوص کا حوالہ دیا جاتا ہے، وہ یہ ہیں:

اما النص فقوله تعالىٰ انما الصدقات للفقراء وقوله عزوجل فى اموالهم حق معلوم للسائل والمحروم والاضافة بحرف اللام تقتضى الاختصاص بجهة	''رہا تملیک کے ثبوت میں نص تو اللہ تعالیٰ کا قول 'اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ' (خیرات کا مال تو بس غریبوں کے لیے ہے) اور دوسری آیت ہے: 'فِىْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ' (اور ان کے مالوں

الملك اذا كان المضاف اليه من اهل الملك. (بدائع الصنائع ۲/۴)

میں سائل اور محروم کے لیے ایک متعین حق ہے) حرف لام کے ذریعہ سے جب اضافت ہوتو وہ ملکیت کے پہلو سے اختصاص کو چاہتی ہے بشرطیکہ مضاف الیہ اہل ملک میں سے ہو۔"

بس یہی دلیلیں ہیں جو تملیک کی تائید میں فقہ کی مختلف کتابوں میں دہرا دہرا کر پیش کی گئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

پہلی دلیل یہ کہ 'ایتاء' اور 'تصدق' کے الفاظ کی حقیقت ہی تملیک ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ 'لِلْفُقَرَآءِ' اور 'لِلسَّآئِلَ وَالْمَحْرُوْمِ' میں جو "لام" ہے، وہ اختصاص ملک کا مقتضی ہے، اگر مضاف الیہ اہل ملک میں سے ہو۔

جہاں تک پہلی دلیل کا تعلق ہے، یہ گزارش ہے کہ اس میں تو شبہ نہیں کہ 'ایتاء' اور 'تصدق' کے الفاظ میں بعض جگہ تملیک کا مفہوم بھی شامل ہو جاتا ہے، لیکن اس میں بہت کچھ دخل قرینہ اور سیاق وسباق کو ہوتا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ ان الفاظ ہی کے اندر تملیک کا مفہوم داخل ہو اور جب یہ بولے جائیں تو تملیک کا مفہوم ان کے اندر سے آپ ہی آپ نکل آئے۔ اگر ایسا ہوتا تو بلا شبہ ان کو تملیک کے ثبوت میں بطور نص کے پیش کیا جا سکتا تھا، لیکن یہ ایک بالکل واضح حقیقت ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ ورنہ ہمیں 'اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ' (ہم نے ان کو کتاب دی) اور 'اٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا' (ہم نے داؤد کو زبور عطا کی) میں بھی تملیک کا مفہوم لینا پڑے گا، حالانکہ ان میں اور اس طرح کے بے شمار استعمالات میں تملیک کے مفہوم کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ پس دیکھنا یہ ہے کہ جہاں جہاں قرآن یا حدیث میں یہ الفاظ ادائے زکوٰۃ و خیرات کے لیے بولے گئے ہیں، وہاں بے تکلف تملیک کی طرف ذہن جاتا ہے یا نہیں؟ میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ قرآن میں جہاں کہیں بھی 'اٰتُوا الزَّکٰوۃَ' یا 'تَصَدَّقُوْا' وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں، وہاں متبادر مفہوم ان الفاظ کا صرف یہی ہے کہ زکوٰۃ دو اور صدقہ دو، سارا زور صدقہ اور زکوٰۃ ادا کرنے پر ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ ادائیگی تملیک فقیر کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں۔ یہ چیز 'اٰتُوا'

اور 'تَصَدَّقُوا' کے الفاظ سے نہیں نکلتی۔ اگر اس کی کوئی اور دلیل ہو تو اس پر غور کیا جا سکتا ہے، لیکن محض 'اٰتُوا' اور 'تَصَدَّقُوا' کے سہارے پر تملیک کو ادائیگی زکوٰۃ کا رکن نہیں قرار دیا جا سکتا۔

چند مثالیں میں قرآن سے پیش کرتا ہوں، ان کو ملاحظہ فرمائیے:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ. (التوبہ ۹:۵)

''پس اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔''

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ. (الحج ۲۲:۴۱)

''جن کا حال یہ ہے کہ اگر ہم ملک میں ان کو اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔''

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ. (المومنون ۲۳:۶۰)

''اور جن کا حال یہ ہے کہ وہ جو کچھ خدا کی راہ میں دیتے ہیں، اس کو خدا سے ڈرتے ہوئے دیتے ہیں۔''

یہ چند آیتیں ہم نے بغیر کسی انتخاب کے نقل کر دی ہیں۔ ان کو خالی الذہن ہو کر پڑھیے اور پھر غور کیجیے کہ ان میں سارا زور زکوٰۃ کے ادا کرنے کے مفہوم پر ہے یا تملیک فقیر کے وجوب پر؟ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد ان سے تعرض نہ کیا جائے یا یہ بتانا چاہتا ہے کہ جب تک یہ تملیک فقیر نہ کر دیں، ان کا پیچھا نہ چھوڑا جائے؟ اسی طرح تیسری آیت پر نگاہ ڈالیے، اس میں 'ایتاء' کا لفظ موجود ہے، لیکن اس سے مقصود ان لوگوں کی انفاق فی سبیل اللہ کی خصلت کا اظہار ہے یا اس بات کا اظہار کہ یہ لوگ اللہ سے ڈرتے ہوئے تملیک فقیر کیا کرتے ہیں[۳]؟

۳؎ یہ لفظ متعدد جگہ قرآن میں تملیک اجتماعی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً: 'وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ'۔ ''اور تمھیں بادشاہ بنایا اور وہ کچھ تمھیں دیا جو دنیا

اب آیئے دو آیتیں 'تصدق' سے متعلق بھی ملاحظہ فرمائیے:

فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنۡ مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ. (المنافقون ۶۳:۱۰) — ''پس میں صدقہ کرتا اور نیکو کاروں میں سے بنتا۔''

فرمائیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ میں مختلف طریقوں سے اللہ کی راہ میں اور غربا کی بہبود کے کاموں میں فیاضی کے ساتھ اپنا مال خرچ کرتا یا یہ ہے کہ میں تملیک فقیر کیا کرتا؟

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنۡ اٰتٰنَا مِنۡ فَضۡلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ. (التوبہ ۹:۷۵) — ''ان میں سے وہ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے یہ عہد کیا تھا کہ اگر اللہ نے ہم کو اپنے فضل سے نوازا تو ہم صدقہ کیا کریں گے۔''

فرمائیے کہ اس قول کے قائلین کے ذہن میں یہ مضمون تھا کہ اگر ہمیں مال ملا تو ہم تملیک فقیر کیا کریں گے یا یہ مقصد تھا کہ اگر ہم کو مال ملا تو ہم اللہ کے راستے میں مختلف طریقوں سے خرچ کریں گے قطع نظر اس سے کہ تملیک ہو یا نہ ہو۔

ان مثالوں کے ذکر سے ہمارا مقصد محض اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ 'ایتاء' یا 'تصدق' کے الفاظ تملیک کے معنی یا مفہوم کے لیے ایسے قطعی نہیں ہیں کہ آپ ان کو تملیک کے ثبوت میں نص کی حیثیت سے پیش کریں۔ ان سے اصلی چیز جو ظاہر ہوتی ہے وہ دینا یا خرچ کرنا ہے۔ یہ دینا اور خرچ کرنا تملیک کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اور بغیر اس کے بھی ہو سکتا ہے۔ تملیک پر اس قدر اصرار اور وہ بھی تملیک کی ایک خاص نوعیت پر کہ اس کے بغیر زکوٰۃ ادا ہی نہ ہو سکے، یہاں تک کہ کوئی شخص زکوٰۃ کے پیسوں سے کسی غریب میت کے لیے کفن بھی نہ خرید سکے، کسی غریب مردہ کا قرض بھی ادا نہ کر سکے، میرے نزدیک ایک بالکل بے حقیقت بات ہے۔

دوسری دلیل میں بنائے استدلال تمام تر ''لام'' پر قائم ہے جس کی پوری حقیقت ہم واضح کر چکے ہیں۔ البتہ یہ پہلو اس میں نیا ہے کہ ''لام'' کو تملیک کے بجائے اختصاص کے مفہوم میں لے کر اس سے اختصاص ملک کا مضمون نکالا گیا ہے اور یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اگر اضافت ''لام'' کے

والوں میں سے کسی گروہ کو بھی نہیں دیا۔'' (المائدہ ۵:۲۰)

ذریعہ سے ہو اور مضاف الیہ اہل ملک میں سے ہو تو وہ اختصاص ملک پر دلیل ہے۔ میرے نزدیک یہ دعویٰ بھی بے بنیاد ہے۔ ہم 'اَلْفَرَسُ لِلرَّاکِبِ' (گھوڑا سوار کے لیے ہے) اور 'اَلْمِنبَرُ لِلْخَطِیْبِ' (منبر خطیب کے لیے ہے) بولتے ہیں۔ ان میں اضافت بھی ''لام'' کے ذریعہ سے ہے اور مضاف الیہ بھی دونوں جملوں میں اہل ملک میں سے ہیں، لیکن ان سے کوئی شخص بھی اختصاص ملک نہیں سمجھتا، بلکہ صرف ایک نوعیت کا اختصاص ہی سمجھتا ہے۔ پھر 'اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ' اور 'فِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ' میں اختصاص ملک کا مضمون کہاں سے آئے گا۔ بہر حال اگر اس استدلال کو تھوڑی دیر کے لیے صحیح بھی فرض کر لیا جائے تو اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک استنباط کی ہوئی، اس کا یہ درجہ نہیں ہے کہ اس کو ایک رکن دین قرار دے دیا جائے اور جہاں اس کی کسی سے کوئی ادنیٰ قسم کی بھی خلاف ورزی صادر ہوئی تو اس کے متعلق قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ وہ ایک حکم شرعی کا منکر ہے۔

کیا ایک مقام کی زکوٰۃ دوسرے مقام پر صرف نہیں ہو سکتی؟

دوسری چیز جو مولانا ظفر احمد صاحب کے مضمون میں نہایت قابل غور اور اہل علم کے فکر و نظر کی محتاج ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک ایک اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کی تحصیل اور اس کی تقسیم کا معیاری طریقہ صرف یہ ہے کہ محصلین زکوٰۃ ہر جگہ کھیتوں، کھلیانوں اور چراگاہوں میں پھیل جائیں، زکوٰۃ وصول کریں اور وہیں غربا میں تقسیم کر دیں۔ اور جب تک اس علاقہ میں غربا و مستحقین موجود ہوں، دوسری جگہ اس علاقہ کی زکوٰۃ منتقل نہ کی جائے۔

قطع نظر اس سے کہ موجودہ زمانہ کی حکومتیں جو محاصل کی تشخیص و تحصیل کے معاملہ میں جدید نظریات کی معتقد ہیں اور ہر کام کو منصوبہ بندی کے تحت کرنا پسند کرتی ہیں، اس چیز کو اپنا سکتی ہیں یا نہیں۔ اس میں دو نہایت واضح قباحتیں ایسی ہیں جن کو ایک عام آدمی بھی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک تو یہ کہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو علاقے زیادہ پست حال ہیں وہ برابر پست حال ہی رہیں،

کم ازکم زکوٰۃ کی مد سے ان کی اصلاح وترقی میں کوئی قابل ذکر حصہ نہیں لیا جاسکتا، کیونکہ پست حال علاقوں میں قدرتی طور پر زکوٰۃ کی آمدنی بہت تھوڑی ہوگی اور دوسرے علاقوں کی زکوٰۃ ان علاقوں کی امداد کے لیے مشکل ہی سے کچھ منتقل کی جاسکے گی۔ دوسری یہ کہ کوئی حکومت کسی منصوبہ بندی کے تحت اپنی زکوٰۃ کی پوری آمدنی کسی ایسی دوررس اور مفید اسکیم پر نہیں خرچ کرسکتی جس سے اس ملک کے پست حالوں اور غریبوں کو بحیثیت مجموعی کوئی مستقل فائدہ پہنچ سکے۔ حالانکہ موجودہ زمانہ منصوبہ بندی کا زمانہ ہے، منصوبہ بندی کے ذریعہ سے اگر کوئی حکومت چاہے تو دیکھتے دیکھتے، اپنے انھی ذرائع سے کام لے کر، جو منتشر طور پر استعمال ہونے کے سبب سے کوئی مؤثر نتیجہ پیدا نہیں کررہے ہیں، اپنے ملک کے غریبوں کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ ہم بات بات پر کہتے ہیں کہ اگر اسلام کا اقتصادی نظام ملک میں جاری ہوجائے تو غریبوں کے آسمان وزمین بدل جائیں گے، لیکن اگر غریبوں کے حصہ کی اصلی آمدنی کا یہی حشر ہوا کہ ہر تھانہ کی زکوٰۃ اسی تھانہ میں تقسیم ہوگئی تو اشتراکیت کا مقابلہ کرنا تو الگ رہا، شاید ہم زکوٰۃ کی آمدنی سے غریبوں کی بے شمار مشکلات میں سے کوئی ایک مشکل بھی حل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں حکومت کی پالیسی عموماً یہی رہی ہے کہ جس جگہ سے زکوٰۃ وصول کی جائے، اگر حقیقی ضرورت وہاں موجود ہو تو وہیں خرچ بھی کردی جائے، وہاں سے مرکز کو منتقل نہ کی جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ایک انتظامی معاملہ تھا جو محض وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت عمل میں آیا تھا یا شریعت کا قانون ہی یہی ہے کہ ہر تھانہ، بلکہ ہر بستی کی زکوٰۃ اسی تھانہ اور اسی بستی میں تقسیم کردی جایا کرے؟ نہایت واضح دلائل کی روشنی میں میرا رجحان یہ ہے کہ یہ محض ایک انتظامی معاملہ ہے۔ اسلامی حکومت اختیار رکھتی ہے کہ وہ چاہے تو ہر تھانہ اور ہر بستی کی زکوٰۃ اسی تھانہ یا بستی میں تقسیم کرادے، چاہے تو کسی خاص علاقہ میں (اگر اس علاقہ میں ایمرجنسی کی صورت پیدا ہوگئی ہو) پورے ملک کی زکوٰۃ اکٹھی کرکے خرچ کردے اور اگر چاہے تو کسی مرکزی اسکیم کے تحت پورے ملک کی زکوٰۃ کنٹرول کرکے اس کو ملک

کے غربا کی کسی نفع بخش اسکیم میں لگا دے، جس سے سب کو فائدہ پہنچے۔

اس کی ایک واضح دلیل تو یہ ہے کہ اگر مقصود انفرادی تقسیم ہی تھی تو زکوٰۃ کے معاملہ کو حکومت کے ہاتھ میں دینے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔ حکومت کے ہاتھ میں تو دیے ہی وہ معاملات جاتے ہیں جن کے اندر کوئی اجتماعی نوعیت کا تصرف پیش نظر ہو۔ اگر یہ چیز مقصود نہیں تھی تو اول تو بہتر یہی تھا کہ سرے سے یہ معاملہ حکومت کے ہاتھ میں دیا ہی نہ جاتا اور اگر دیا بھی جاتا تو بس اس حد تک کہ اس کے عمال ہر جگہ صرف اس بات کی نگرانی کرتے رہتے کہ لوگ اپنی اپنی زکوٰۃ نکالیں اور غربا میں تقسیم کر دیا کریں۔ اگر لوگ اس میں سست پڑتے نظر آتے تو ان کو ترغیب یا ترہیب سے اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے۔

دوسری دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر یہ معاملہ محض انتظامی نوعیت کا نہ ہوتا، بلکہ شریعت کا حکم ہی یہ ہوتا کہ ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل نہ ہو تو کم از کم صدر اول میں تو اس کا امکان نہیں تھا کہ اس حکم کی خلاف ورزی کی جا سکتی، لیکن ہم صاف دیکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں مرکزی حکومت براہ راست اپنی ہدایات کے تحت زکوٰۃ کو منتقل بھی کراتی ہے اور نہیں بھی کراتی ہے، کبھی اپنا حصہ کچھ مقرر کر لیتی ہے کبھی کچھ کر لیتی ہے، بلا لحاظ اس کے کہ مقامی غربا کی ضروریات پوری ہو چکی ہیں یا نہیں؟ جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں قانون کے تحت سارے اختیارات حکومت کو حاصل ہیں۔ وہ مختلف علاقوں کے حالات اور غربا کے مصالح کے تحت اس میں ہر قسم کا تصرف کر سکتی ہے۔ ذیل میں ہم اہل علم کے غور کرنے کے لیے اپنے خیال کی تائید میں چند دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

جس زمانہ میں مدینہ میں مہاجرین کا مسئلہ اقتصادی نقطۂ نظر سے ایک پیچیدہ مسئلہ بنا ہوا تھا، اس زمانہ میں اطراف مدینہ کی زکوٰۃ بڑے اہتمام کے ساتھ وصول کرا کے مدینہ منگوائی جاتی تھی تاکہ مہاجرین کی مشکلات حل کی جا سکیں۔ یہاں تک کہ ایک اعرابی نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وصولی زکوٰۃ کے سلسلہ میں عمال کے رویہ کی سختی کی شکایت کی کہ صدقہ کی ایک بکری کی

خاطر مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں میں قتل نہ کر دیا جاؤں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں اس سختی کے لیے جو وجہ بیان فرمائی، وہ یہ تھی کہ:

لو لا انها تعطى فقراء المهاجرين ما اخذتها. (نیل الاوطار ۴/۲۱۶)	''اگر یہ چیز غریب مہاجرین کو نہ دینی ہوتی تو میں اس کو نہ لیتا۔''

جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حوالی مدینہ کی زکوٰۃ وصول کرا کے مدینہ منگوانے کی اصلی وجہ یہی تھی کہ مدینہ میں بے سہارا مہاجرین کا مسئلہ حکومت کے لیے حل کرنا ضروری تھا۔ یہ وجہ نہ تھی کہ حوالی مدینہ میں زکوٰۃ کے مستحقین موجود ہی نہ تھے۔

مہاجرین کے اسی مسئلہ کے سبب سے اہل یمن کے ساتھ زکوٰۃ کے معاملہ میں دو مختلف زمانوں میں دو مختلف پالیسیاں اختیار کی گئیں۔ جس زمانہ میں مہاجرین کا مسئلہ حکومت کے سامنے تھا اور غالباً کپڑوں کی ان کے لیے شدید ضرورت تھی، اس زمانہ میں یمن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اہل یمن سے ان کے صدقات کی تمام اصناف و اجناس کے بدلہ میں صرف نئے اور پرانے کپڑے وصول کیے اور وہ سارے کپڑے مہاجرین کے لیے مدینہ روانہ کر دیے۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقامی کم اہم ضروریات کے مقابل میں انھوں نے مہاجرین کی زیادہ اہم ضرورت کو مقدم رکھا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے اعلان کے الفاظ ملاحظہ ہوں جس سے صاف وہ مفہوم نکلتا ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے:

ائتونی بكل خميس ولبيس آخذه منكم مكان الصدقة فانه ارفق بكم وانفع للمهاجرين والانصار بالمدينة. (نیل الاوطار ۴/۲۱۶)	''تم میرے پاس ہر قسم کے نئے اور پرانے کپڑے لاؤ، میں صدقہ کے معاوضہ میں اس کو قبول کر لوں گا، اس میں تمھیں آسانی ہو جائے گی اور مدینہ کے مہاجرین اور انصار کا بھلا ہو جائے گا۔''

کون کہہ سکتا ہے کہ ان کپڑوں کے مدینہ بھیجنے کا سبب صرف یہ تھا کہ یمن میں اس کے مستحقین موجود نہیں تھے؟ مستحقین رہے ہوں، لیکن مدینہ کے مستحقین کا معاملہ مختلف پہلوؤں سے زیادہ

اہمیت رکھتا تھا، اس وجہ سے ان کو مقامی مستحقین پر ترجیح دی گئی۔

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب یہ مہاجرین کا مسئلہ بالکل حل ہوگیا تو اسی یمن کی زکوٰۃ کا صرف ایک تہائی حصہ انھی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے مدینہ بھیجا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر اعتراض کیا کہ میں نے تمھیں ٹیکس وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا ہے، اس لیے بھیجا ہے کہ وہاں کے مال داروں سے وصول کرو اور وہیں کے غریبوں میں تقسیم کردو۔ اور جب تک حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے ان کو یہ اطمینان نہیں دلا دیا کہ یہاں زکوٰۃ کے مزید حق دار موجود ہی نہیں ہیں، اس وقت تک انھوں نے وہاں کی زکوٰۃ مدینہ بھیجنے کی اجازت نہیں دی۔

اسی طرح ایک سے زیادہ مثالیں اس بات کی موجود ہیں کہ مرکز نے کسی مقام کی زکوٰۃ میں اپنا ایک متعین حصہ مقرر کر دیا ہے اور اس بات کی کوئی تصریح نہیں کی ہے کہ مرکز کا حصہ صرف اس حالت میں مرکز کو بھیجا جائے، جبکہ کوئی مقامی مستحق موجود نہ رہے۔ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق ابو عبید نے یہ روایت نقل کی ہے:

قال لابن ابی ذباب و بعثه بعد عام الرمادة فقال اعقل علیهم عقالین فاقسم فیهم احدهما وائتنی بالاخر. (کتاب الاموال ۶۰۰)

”عام الرمادہ کے قحط کے موقع پر حضرت عمر نے زکوٰۃ کی تحصیل کا کام روک دیا تھا، جب قحط دور ہوگیا تو انھوں نے ابن ابو ذباب کو تحصیل زکوٰۃ کے کام پر مقرر کیا اور ان کو یہ حکم دیا کہ لوگوں سے اکٹھے دو سالوں کی زکوٰۃ وصول کرو، آدھی ان میں تقسیم کر دو، آدھی میرے پاس بھیج دو۔“

اسی طرح ایک روایت حضرت عمر بن عبدالعزیز کے متعلق بھی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے اموال زکوٰۃ میں مرکز کا حصہ آدھا مقرر کیا۔ پھر دوسرے سال جب انھوں نے مرکز کے لیے ضرورت نہیں محسوس کی تو ہر جگہ زکوٰۃ مقامی طور پر ہی تقسیم کر دینے کا حکم دے دیا:

عن ابن جریج قال کتب عمر بن

”ابن جریج راوی ہیں کہ حضرت عمر بن

العزیز الی عماله ان ضعوا شطر الصدقة ... و ابعثوا الی بشطرها قال ثم کتب فی العام المقبل ان ضعوھا کلھا. (کتاب الاموال ۵۹۴)	عبدالعزیز نے اپنے تحصیل داروں کو لکھا کہ زکوٰۃ کی آدھی رقم مقامی ضروریات کے لیے رکھ چھوڑو اور آدھی میرے پاس بھیج دو۔ پھر دوسرے سال انھوں نے یہ حکم جاری کر دیا کہ ساری کی ساری مقامی ضروریات ہی کے لیے رکھ چھوڑو۔''

مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ زکوٰۃ کی وصولی اور اس کی تقسیم سے متعلق یہ تصور کچھ بہت صحیح نہیں ہے کہ ہر گاؤں اور ہر تھانہ کی زکوٰۃ وہیں وصول کر کے کھڑے کھڑے تقسیم کر دی جایا کرے، بلکہ، جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ معاملہ تمام تر حکومت کی صواب دید پر منحصر ہے۔ وہ چاہے تو مقامی طور پر تقسیم کرادے، چاہے تو اس میں مرکز کا کوئی متعین حصہ مقرر کر دے، چاہے تو کسی اہم ضرورت کے پیش نظر کسی علاقہ کی پوری زکوٰۃ کسی دوسرے علاقہ کے غربا کی امداد کے لیے اس علاقہ میں بھیج دے۔ اور اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اگر چاہے تو پورے ملک کی زکوٰۃ مرکزی کنٹرول میں لے کر زکوٰۃ کے مذکورہ مصارف میں سے کسی ایک ہی مصرف پر صرف کرے یا ملک کے غربا کی اجتماعی بہبود کی کسی خاص اسکیم پر صرف کرے۔

ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا، تو ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ:

خذھا من اغنیاء ھم و ضعھا فی فقرائھم.	''ان کے مال داروں سے زکوٰۃ وصول کرو اور ان کے غریبوں میں اس کو بانٹ دو۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ ہر جگہ کے مقامی مال داروں کی زکوٰۃ کے اصلی مستحق اسی مقام کے غربا ہیں۔ ہمارے نزدیک اس شبہ کی بنیاد کچھ قوی نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ خود حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں سمجھا کہ ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ اس کا یہ مطلب سمجھتے تو یہ بات کس طرح ممکن تھی کہ وہ اس حکم

کے بالکل خلاف اہل یمن کے سامنے یہ اعلان کرتے کہ:

ائتونی بکل خمیس ولبیس آخذه منکم مکان الصدقة فانه ارفق بکم وانفع للمهاجرین والانصار بالمدینة. (نیل الاوطار ۴/۲۱۶)	''ہر قسم کے نئے اور پرانے کپڑے میرے پاس لاؤ، میں صدقہ کی جگہ ان کو قبول کروں گا، اس میں تمھیں بھی آسانی ہوگی اور مدینہ کے مہاجرین وانصار کا بھی بھلا ہوگا۔''

اب یا تو یہ ہو کہ عام پالیسی تو یہی رہی ہو کہ مقامی اغنیا سے زکوٰۃ وصول کرکے وہیں مقامی غربا میں تقسیم کردی جایا کرے، لیکن خاص مرکز کی ہدایت کے تحت مہاجرین کی ضرورت کے پیش نظر انھوں نے کسی سال اہل یمن سے مذکورہ بالا مطالبہ کیا ہو یا یہ ہو کہ انھوں نے 'تو خذ من اغنیاء هم و ترد علی فقرائهم' کو اس کے وسیع معنی میں لیا ہو اور ایک انتظامی حکم کی حیثیت سے حالات اور مصالح کے تحت جب جیسا مناسب خیال کیا ہو، اس پر عمل کیا ہو۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں سے جو شکل بھی فرض کی جائے، یہ چیز بالکل صاف واضح ہے کہ یہ لازمی نہیں ہے کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ وہیں تقسیم کی جایا کرے۔

پبلک اداروں کی حیثیت

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ زکوٰۃ کے وصول کرنے اور اس کے تقسیم کرنے کا فریضہ اصلاً ایک اسلامی حکومت ہی سے متعلق ہے۔ وہی جائز طور پر اس بات کی حق دار ہے کہ مال داروں سے اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کرے اور اس کے مصارف میں اس کو صرف کرے، لیکن اگر کسی جگہ کے مسلمان ایک صحیح اسلامی حکومت یا کم از کم جائز قسم کی اسلامی حکومت کی برکت سے محروم ہوں تو ان کے لیے صحیح طریقہ کیا ہے؟ کیا یہ کہ ان میں سے ہر شخص خود مستحقین کو تلاش کرکے ان میں اپنی زکوٰۃ تقسیم کردے یا یہ کہ زکوٰۃ وصول کرنے اور تقسیم کرنے کے لیے انھیں اپنے اندر کوئی اجتماعی نظم پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور اس کے ذریعہ سے زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا ممکن حد تک کوئی مناسب بندوبست کرنا چاہیے؟ اس سوال کے جواب میں میرا رجحان یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے

یہ دوسری ہی صورت صحیح ہے۔ میرے نزدیک اس کی دو وجہیں ہیں:

ا۔ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ اگر اس کے احکام میں سے کسی حکم کی بجا آوری اس کی اصلی معیاری شکل میں کسی مانع کے سبب سے ممکن نہ ہو تو وہ چاہتا ہے کہ اس حکم کی تعمیل کسی ایسی شکل میں کی جائے جو اصلی شکل سے ملتی جلتی یا کم از کم ذہنوں کے اندر اصلی شکل کی یاد محفوظ کرانے والی ہو تاکہ اصلی حالت کی طرف لوٹنے اور اس کو دوبارہ حاصل کرنے کا شوق دلوں کے اندر قائم رہے۔ چنانچہ جب وضو کرنا کسی مانع کے سبب سے ممکن نہیں ہوتا ہے تو اس کی جگہ پر تیمّم کی ہدایت کی گئی ہے، اگر نماز اس کی اصلی صورت میں ادا کرنی ممکن نہ ہو تو اس سے قریب تر صورت پر اس کو ادا کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ جنگ کے خطرناک ترین حالات کے اندر بھی اس کے لیے ایسی صورتیں تجویز کی گئی ہیں جس سے اس کی اصلی صورت کا تصور ذہنوں میں باقی رہ سکے۔ یہی صورت حال دین کے دوسرے احکام کے اندر بھی ہے۔ اگر ان کو اس معیاری شکل میں ادا نہیں کیا جا سکتا ہے جو قرآن یا حدیث میں ان کے لیے تجویز کی گئی ہے تو حالات کے لحاظ سے اصل سے ممکن حد تک قریب تر شکل میں ان کو ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس کلیہ کو پیش نظر رکھ کر اگر زیر بحث سوال پر غور کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا کام دین میں اجتماعی طور پر مطلوب ہے اور اس کے انجام دینے کی اصلی مجاز اور حق دار درحقیقت ایک اسلامی حکومت ہی ہے، اس وجہ سے اس کی عدم موجودگی میں دین کے مزاج سے قریب تر بات یہی ہو گی کہ مسلمانوں کے اندر جس طرح کا نظام شرعی بھی موجود ہو، اسی کو اس فرض کی انجام دہی کا ذریعہ بنایا جائے۔ اور اگر خدانخواستہ کسی قسم کی بھی کوئی اجتماعی تنظیم دینی باقی نہ رہ گئی ہو تو مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اسی قسم کی کوئی تنظیم قائم کرنے کی کوشش کریں۔ حد یہ ہے کہ اگر کوئی ایک بھی تنظیم قائم نہ ہو سکے تو اصل سے قریب تر لانے کے لیے یہ شکل بھی گوارا کی جا سکتی ہے کہ ایک سے زیادہ تنظیمیں ہوں جو اپنے اپنے حلقۂ اثر اور اپنے دائرۂ اعتماد کے اندر اس فرض کو انجام دیں۔ اگرچہ ایک تنظیم کی جگہ کئی تنظیموں کا ہونا ایک انتشار کی

صورت ہے، لیکن اصل نصب العین سے ذہنوں کو وابستہ رکھنے کے لیے یہ اس کے مقابل میں کہیں بہتر ہے کہ سرے سے کوئی نظم ہی باقی نہ رہ جائے اور ایک کامل انتشار کی حالت طاری ہو جائے۔

۲۔ اگر کسی نوعیت کی بھی کوئی تنظیم باقی نہ رہ جائے یا کسی تنظیم کے بھی، جو موجود ہو، استحقاق کو تسلیم نہ کیا جائے، بلکہ ایک ایک شخص پر اس کی زکوٰۃ کے ٹھکانے لگانے کی ذمہ داری ڈال دی جائے تو یہ چیز اغنیا کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت مضر ہو گی اور غربا کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت مہلک ہو گی۔ اول تو کسی محرک یا داعی کے نہ ہونے کے سبب سے بہت زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ جو مسلمان آج اپنے مالوں کی زکوٰۃ نکالتے ہیں، وہ زکوٰۃ نکالنی ہی چھوڑ دیں۔ اور اگر نکالیں بھی تو ان کی سہل انگاریوں کی وجہ سے اس کا بڑا حصہ ضائع ہی ہو جائے، بازار میں ایک تنظیم کے زیر اہتمام فروخت ہونے کی صورت میں قربانی کی جس کھال کی قیمت تین چار روپے مل سکتی ہے، بہت ممکن ہے کہ انفرادی طور پر فروخت کرنے کی صورت میں محلّہ کا قصاب اس کے آٹھ آنے پیسے بھی نہ دے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے کسی صریح نقصان کو، جس میں زکوٰۃ دینے والے اور زکوٰۃ پانے والے دونوں شریک ہوں، اسلام کسی حالت میں بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے زکوٰۃ پانے والوں اور زکوٰۃ دینے والوں، دونوں کی مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ اگر اسلامی حکومت باقی نہیں رہی ہے تو جو بھی مذہبی ادارے مسلمانوں کے اندر موجود ہیں، وہی ان کاموں کو حتی الامکان سنبھال لیں جو اجتماعی طور پر کرنے کے ہیں۔ جہاں تک دینے والوں کا تعلق ہے، اگر وہ ان پر اعتماد کرتے ہیں تو یہ ادارے بلا اختلاف ان کے نمائندے اور وکیل ہیں۔ اور جہاں تک غربا کا تعلق ہے، ایک ایسے ملک میں جہاں اسلامی حکومت موجود نہیں ہے، ان کی مثال ایسے یتامیٰ کی ہے جن کا کوئی جائز ولی موجود نہیں رہا ہے۔ اس وجہ سے جو ادارہ بھی ان کے حقوق ان تک پہنچانے اور ان کی خدمت کرنے کی ذمہ داری اٹھالے گا، اس کو اس خاص دائرہ کے اندر کامل قسم کی نہ سہی، لیکن ایک ناقص قسم کی ولایت تو بہرحال حاصل ہو ہی جائے گی۔

پس یہ بات عقل کے بالکل مطابق اور اسلام کے مزاج کے بالکل موافق معلوم ہوتی ہے کہ

اسلامی حکومت کی عدم موجودگی کی صورت میں وہ پبلک ادارے مسلمانوں کی زکوٰۃ اکٹھی کرکے غربا کے مصالح پر صرف کریں جن کو پبلک کا اعتماد حاصل ہو، کیونکہ یہ صورت اختیار نہ کرنے کی صورت میں جو انتشار رونما ہوگا، وہ اغنیا اور فقرا دونوں کے نقطۂ نظر سے نہایت درجہ نقصان رساں ہے۔ اسی مصلحت کو سامنے رکھ کر مولانا مفتی کفایت اللہ مرحوم نے انگریزی دور میں مندرجہ ذیل فتویٰ دیا تھا جو میرے نزدیک نہایت گہری دینی مصلحت پر مبنی ہے۔ میں یہ فتویٰ ناظرین کی آ گاہی کے لیے یہاں درج کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں:

''زکوٰۃ وعشر وغیرہ فرائض مالیہ کا وجوب جن حکم شرعیہ اور مصالح بشریہ پر مبنی ہے، ان کا تقاضا یہ ہے کہ ادائے زکوٰۃ وعشر اور مستحقین پر ان کی تقسیم میں تنظیم کا کامل لحاظ رکھا جائے اور ظاہر ہے کہ انفرادی تصرفات میں تنظیم مفقود ہوتی ہے۔

اس غلامی کے دور میں جو تفرق وتشتت کا دور ہے، امکانی صورت یہی نظر آتی ہے کہ اہل حل و عقد کی کوئی جماعت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے۔[۴]''

مصارف زکوٰۃ

اگر مذکورہ تینوں باتیں صحیح مان لی جائیں، یعنی:

ایک یہ کہ ادائیگی زکوٰۃ کے لیے تملیک کوئی ضروری شرط نہیں ہے۔ اس کے حق میں کوئی نص موجود نہیں ہے۔ جو لوگ تملیک کے رکن یا شرط ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں جو کچھ پیش کرتے ہیں، اس کی حیثیت ایک استنباط سے زیادہ نہیں ہے۔ اور محض ایک استنباط اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس کی بنا پر تملیک کو زکوٰۃ کا رکن قرار دیا جائے۔

دوسری یہ کہ ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل ہو سکتی ہے۔ ایک اسلامی حکومت اس بات کی پوری طرح مجاز ہے کہ وہ چاہے تو ہر جگہ کی زکوٰۃ وہیں کے مقامی غربا پر صرف کر دے، چاہے تو کسی

---

[۴] کتاب العشر والزکوٰۃ، عبدالصمد رحمانی، ۱۰۷۔

خاص علاقہ کی زیادہ شدید ضرورت کی بنا پر وہاں منتقل کردے، چاہے تو ہر علاقہ کی زکوٰۃ میں سے مرکز کا ایک حصہ متعین کردے اور اس کو خاص اپنے اہتمام میں صرف کرے۔ اور اگر چاہے تو پورے ملک کی زکوٰۃ اپنے اہتمام میں لے کر غربا کی بہبود کی کسی خاص اسکیم پر خرچ کرے۔

تیسری یہ کہ ایک اسلامی حکومت کی عدم موجودگی کی حالت میں مسلمانوں کے لیے صحیح صورت زکوٰۃ کے جمع کرنے اور خرچ کرنے کی یہ ہے کہ وہ اپنے اندر اس کے لیے کوئی اجتماعی نظم قائم کرنے کی کوشش کریں۔ اگر اس طرح کا کوئی ایک ہی اجتماعی نظم قائم نہ ہو سکے تو پھر ادنیٰ درجہ میں ان کے لیے اسلام کے مزاج سے اور اس پالیسی سے، جو اس نے زکوٰۃ کی جمع و تقسیم کے بارہ میں پسند کی ہے، قریب یہ بات ہے کہ ان کے مختلف طبقات اور جماعتیں جن اسلامی ادارات پر اعتماد کرتے ہیں، انھی کو وہ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا ذریعہ بنائیں تاکہ ممکن حد تک زکوٰۃ کی افادیت اور غربا کی بہبود کو ملحوظ رکھا جا سکے۔ غربائے مسلمین کی حقیقی ولی ـــــ اسلامی حکومت ـــــ کی عدم موجودگی میں انھی ادارات کو ان کی ولایت حاصل ہے۔ اور انھی کو یہ حق ہے کہ جب تک کوئی بہتر نظم وجود میں نہ آجائے، یہ غربا کے لیے زکوٰۃ جمع کریں اور اسے غربا کے مصالح میں صرف کریں۔

اگر یہ تینوں باتیں اہل علم اور اہل دین کو اپیل کرتی ہیں اور ان کے حق میں جو دلیلیں اوپر بیان ہوئی ہیں، وہ کچھ جان دار اور وزنی معلوم ہوتی ہیں تو پھر زکوٰۃ کے مصارف پر ایک وسیع زاویۂ نگاہ سے غور کرنا پڑے گا اور میں چاہتا ہوں کہ اپنا نقطۂ نظر یہاں اہل علم کے سامنے رکھ دوں تاکہ وہ اس پر غور کر سکیں۔ قرآن مجید میں، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، زکوٰۃ کے مصارف کی تعیین سورۂ توبہ کی اس آیت سے ہوتی ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْھَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُھُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَابْنِ السَّبِیْلِ. (۹:۶۰)

میں اسی آیت کے مختلف اجزا کی وضاحت کروں گا:

ا۔ فقرا اور مساکین

زکوٰۃ کا سب سے پہلا مصرف فقرا اور مساکین کو بتایا گیا ہے۔ یہ ذکر میں تقدیم اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ان کا حق مقدم ہے۔ یہ دونوں لفظ جب الگ الگ استعمال ہوتے ہیں تو بسا اوقات ایک دوسرے کے ہم معنی کی حیثیت سے استعمال ہوتے ہیں، لیکن جب ایک ساتھ آتے ہیں تو استعمالات سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں ایک لطیف قسم کا فرق ہوتا ہے۔ فقیر سے وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو کمانے، ہاتھ پاؤں مارنے، زندگی کے لیے جدوجہد کرنے کا دم داعیہ تو رکھتے ہیں، لیکن مالی احتیاج ان کے راستہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہوتی ہے۔ اور مسکین سے وہ طبقہ مراد ہوتا ہے جو مسلسل غربت اور احتیاج کا شکار رہنے کے سبب سے جدوجہد کرنے اور مشکلات پر قابو پانے کا حوصلہ ہی کھو بیٹھتا ہے اور اس کے اوپر دل شکستگی اور مسکنت طاری ہو جاتی ہے۔ زکوٰۃ کا اولین مصرف یہ ہے کہ سوسائٹی کے ان دونوں طبقات کو اٹھانے کی کوشش کی جائے۔

اس اٹھانے میں جس طرح یہ بات شامل ہوگی کہ ان کی جسمانی ضروریات ـــــ کھانا، کپڑا، اور مسکن ـــــ فراہم کی جائیں، اسی طرح ان کی عقلی اور اخلاقی ترقی کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جائے۔ جس طرح یہ لازمی ہے کہ ان کی وقتی احتیاج رفع کی جائے، اسی طرح یہ بھی غالباً ضروری ہے کہ ان کو مفلسی اور بدحالی کی دلدل سے نکالنے کی مستقل تدبیریں اختیار کی جائیں تاکہ وہ اپنی ذاتی جدوجہد اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل بوتے پر سوسائٹی کے اندر باعزت زندگی بسر کر سکیں اور مستقلاً دوسروں پر بار بنے رہنے کے بجائے دوسروں کے بوجھ اٹھانے کے قابل ہو سکیں۔ ان مقاصد کے پیش نظر زکوٰۃ کی مد سے ان کے لیے روٹی، کپڑا اور مکان بھی مہیا کیا جا سکتا ہے، ان کے لیے تعلیمی اور تربیتی ادارے بھی کھولے جا سکتے ہیں، ان کے لیے دارالمطالعے اور کتب خانے بھی قائم ہو سکتے ہیں، ایسے صنعتی ادارے بھی ان کے لیے جاری کیے جا سکتے ہیں، جن میں ان کے بچے مختلف قسم کی صنعتیں سیکھ کر مستقبل میں اپنے اوپر اعتماد کرنے کے قابل بن سکیں۔ اسی طرح ان کے علاج کے لیے ایسے شفاخانے بھی کھولے جا سکتے

ہیں جہاں بوقت ضرورت ان کو مفت دوا حاصل ہو سکے۔ جہاں ان کی عورتوں کو ولادت کے موقع پر مفت طبی امداد حاصل ہو سکے۔علیٰ ہذا القیاس، ان کے مردوں کی تجہیز و تکفین کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے اور ان کے زندوں اور مردوں کے قرضے بھی ادا کیے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض صورتوں میں تملیک ہو گی، بعض صورتوں میں نہیں ہو گی، لیکن زکوٰۃ کا نفع ہر صورت میں اصلاً غربا ہی کو پہنچے گا یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اجتماعی تملیک بہرحال غربا ہی کی ہو گی۔ اور اوپر ہم بتا چکے ہیں کہ اگر استدلال کی بنیاد 'ایتاء' کے لفظ پر ہے تو یہ لفظ اجتماعی تملیک کے لیے قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔

۲۔ عاملین زکوٰۃ

زکوٰۃ کا دوسرا مصرف زکوٰۃ کے عاملین ہیں۔ اگرچہ یہ زکوٰۃ کے مستحق تبعاً اور ضمناً ہیں۔ اصلاً نہیں ہیں، لیکن زکوٰۃ کی تحصیل و وصول میں چونکہ ان کو ایک ناگزیر عامل کی حیثیت حاصل ہے، اس وجہ سے ان کا ذکر دوسرے ہی نمبر پر آ گیا ہے، عاملین سے مراد زکوٰۃ کے وصول کرنے والے کارکن ہیں۔ اس لفظ کے اندر تحصیل دار سے لے کر اس کے پٹواری اور سپاہی تک سب شامل ہیں:

قال ابن عباس و یدخل فی العامل، الساعی و الکاتب و القاسم و الحاشر الذی یجمع الاموال و حافظ المال و العریف. (نیل الاوطار۴/۱۸۰)	''ابن عباس کہتے ہیں کہ عامل کے لفظ کے اندر تحصیل دار، منشی، تقسیم کرنے والا، مال اکٹھا کرنے والا، خزانچی اور مکھیا سب شامل ہیں۔''

احادیث اور تاریخ کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام کمیشن اور اجرت پر بھی لیا جاتا رہا ہے اور اس غرض کے لیے وصولی زکوٰۃ کے موسم میں خاص طور پر کارکن بھی بھرتی کیے جاتے رہے ہیں، لیکن یہ موقع ان تفصیلات میں جانے کا نہیں ہے۔ یہاں جو کچھ سامنے لانا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ایک اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کی تحصیل اور اس کے اہتمام و انتظام پر جو عملہ مقرر ہو گا، اس کے چھوٹے اور بڑے سارے کارکنوں کی تنخواہیں اس سے دی جا سکتی ہیں۔ اس کے آمد و خرچ کے

ریکارڈ رکھنے کے لیے جو دفاتر قائم ہوں گے، ان پر بھی اسی مد سے لازماً خرچ ہوگا۔ اور جب عاملین علیہا کے معاوضے اور ان کے دفاتر کے خرچ اس مد سے پورے کیے جا سکتے ہیں تو ''عمل علیہا'' پر یعنی حمل ونقل، فراہمی اور حفاظت وغیرہ پر، نیز اس سلسلہ کے پروپیگنڈے پر جو کچھ خرچ ہوگا، آخر وہ کیوں نہیں اس مد سے پورا کیا جا سکتا؟

ایک اسلامی حکومت کی عدم موجودگی کی صورت میں اگر اسلامی اداروں کو زکوٰۃ کی وصولی اور اس کے صرف کا حق حاصل ہے، اور اس عاجز کے نزدیک ان کو یہ حق حاصل ہے، جیسا کہ دلائل کے ساتھ اوپر عرض کیا گیا تو لازماً یہ حق بھی ان کے لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ زکوٰۃ کے مال اکٹھا کرنے، ان کے حساب کتاب رکھنے، ان کے لانے اور لے جانے، ان کے محفوظ کرنے اور محفوظ رکھنے، ان کے مصارف میں ان کے صرف کرنے پر، نیز اس مقصد کے لیے دعوت وتبلیغ پر جو کچھ وہ خرچ کریں گے، وہ سب اس مد سے دیا جا سکتا ہے۔

۳۔ مؤلفۃ القلوب

زکوٰۃ کا تیسرا مصرف مؤلفۃ القلوب ہیں۔ ابن کثیر نے مؤلفۃ القلوب کی مندرجہ ذیل قسمیں گنائی ہیں:

۱۔ ایسے غیر مسلم لیڈر اور سردار جن کو اسلام کی طرف مائل کرنا مقصود ہو۔

۲۔ ایسے با اثر نومسلم جن کے اسلام سے پھر جانے کا اندیشہ ہو اور جن کا ارتداد اسلام اور مسلمانوں کے لیے مضر ہو سکتا ہو۔

۳۔ ایسے با اثر لیڈر جن کی تالیف قلب ان کے ہم چشموں کو اسلام کی طرف مائل کرنے میں مددگار ہو سکتی ہو۔

۴۔ ایسے سردار جو اپنے علاقہ میں اسلامی حکومت کو مالیہ کی وصولی میں مدد دیں اور سرحدی علاقوں کو دشمن کے خطرات سے محفوظ رکھنے میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں[۵]۔

۵؎ دیکھو تفسیر ابن کثیر ۲/۳۶۵۔ تفسیر آیہ 'اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ الآیہ'۔

ایسے نومسلم یا غیر مسلم سردار جن کو اسلام کے حق میں ہموار کرنے یا جن کو اسلام پر ثابت قدم رکھنے کے لیے صدر اول میں اسلامی بیت المال سے بھاری بھاری رقمیں دی گئی ہیں، ابن جوزی کے بیان کے مطابق تقریباً پچاس ہیں، جن میں سے چند ایک کے نام امام شوکانی نے ''نیل الاوطار'' میں بھی گنائے ہیں جن کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سو سو اونٹ دلوائے۔ ہم یہ نام یہاں نقل کرتے ہیں تا کہ اندازہ ہو سکے کہ کس کس طرح کے سرداران قبائل اور با اثر اشخاص مؤلفۃ القلوب کے زمرہ میں شامل رہے ہیں اور زکوٰۃ کی مد سے عطیے پانے کے مستحق قرار دیے گئے ہیں۔

صاحب ''نیل الاوطار'' نے جن ناموں کا حوالہ دیا ہے، وہ یہ ہیں:

ابوسفیان بن حرب، صفوان بن امیہ، عیینہ بن حصن، اقرع بن حابس، عباس بن مرداس، علقمہ بن علاثہ۔

ابن کثیر نے زید الخیر کا نام بھی اس فہرست میں شامل کیا ہے۔ جو لوگ اس دور کی تاریخ سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان میں سے بیشتر وہ لوگ ہیں جو اسلام کی تاثیر سے نہیں، بلکہ اسلام کی قوت سے مرعوب ہو کر اس کے مطیع ہوئے تھے، بلکہ ان میں سے صفوان بن امیہ کو تو کفر پر باقی رہتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے بڑے عطیے دیے، یہاں تک کہ خود ان کا اپنا بیان یہ ہے کہ حنین کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیا اور اس وقت میرے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی دوسرا مبغوض نہ تھا، لیکن آپ برابر دیتے رہے یہاں تک کہ پھر آپ سے زیادہ میرے نزدیک کوئی دوسرا محبوب نہ رہا۔

مذکورہ ناموں اور مذکورہ مقاصد پر ایک نظر ڈال کر ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ خرچ ایک بالکل پولیٹیکل خرچ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو جو سیاسی اہمیت اور پولیٹیکل اثر و اقتدار رکھتے ہیں، اسلام اور اسلامی حکومت کے حق میں ہموار کیا جائے اور اگر وہ اسلام کے اندر (کسی نوعیت سے سہی) داخل ہو چکے ہیں تو ان کو اسلام پر مضبوط کیا جائے۔

احناف کے نزدیک اسلام کے غلبہ و اقتدار کے نمایاں ہو جانے کے بعد یہ مد ساقط ہو گئی، لیکن

یہ بات کئی پہلوؤں سے کمزور معلوم ہوتی ہے۔

اور تو جس واقعہ سے وہ اس کے سقوط پر استدلال کرتے ہیں، اس سے زیادہ سے زیادہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک خاص علاقہ کے سرداروں کو غلبۂ اسلام کے بعد ان رعایتوں سے محروم کر دیا جو انھیں بغرض تالیف قلوب حاصل تھیں۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی علاقہ میں اسلامی حکومت اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ اسے اس طرح کے کسی پولیٹیکل خرچ کے سہارا لینے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے تو وہ اس کو خواہ مخواہ کیوں جاری رکھے گی؟ لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ اب کہیں بھی اس کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے یا کبھی بھی اس کی ضرورت نہیں پیش آ سکتی ہے۔

دوم یہ کہ اگر یہ مد اس لیے ساقط قرار دی گئی تھی کہ اس وقت اسلام کو پورا غلبہ حاصل ہو گیا تھا تو اب اس زوال اور مسلمان حکومتوں کے اس ضعف کے دور میں اس کو از سر نو بحال ہو جانا چاہیے، کیونکہ اس دور میں تو شاید ہی کوئی مسلمان حکومت ایسی ہو جو اپنے حق میں دوسروں کو رام کرنے اور خود اپنوں کو اپنے حق میں ہموار رکھنے کی ضرورت سے بالکل مستغنی ہو۔

سوم یہ کہ کوئی حکومت خواہ کتنی ہی طاقت ور کیوں نہ ہو جائے، وہ اس قسم کے پولیٹیکل خرچ سے کبھی مستغنی نہیں ہو سکتی۔ امریکہ اور روس جیسی حکومتیں بھی آج اس بات کی محتاج ہیں کہ دوسروں کو اپنے اور اپنے نصب العین کے حق میں ہموار رکھنے کے لیے لاکھوں روپے خرچ کریں۔ پھر آج اگر ایک صحیح قسم کی اسلامی حکومت قائم ہو تو کس طرح اس چیز سے مستغنی رہ سکے گی۔ البتہ اگر فرق ہو گا تو یہ فرق ہو گا کہ اسلامی حکومت یہ سب کچھ دین حق اور کلمۂ حق کی سر بلندی کے لیے کرے گی اور یہ حکومتیں یہ سب کچھ کلمۂ کفر کی سر بلندی کے لیے کرتی ہیں۔

چنانچہ دوسرے علما اور ائمہ یہی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔

ابوعبید ''کتاب الاموال'' میں حنفیہ کے نقطۂ نظر پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وا ما ما قال الحسن و ابن شہاب ''اور یہ جو حسن اور ابن شہاب نے کہا ہے

فعلی ان الامر ماض ابدًا و هذا هو القول عندی لان الایة محکمة لا نعلم لهانا سخا من کتاب و لا سنة فاذا کان قوم هذا حالهم، لا رغبة لهم فی الاسلام الا للنیل و کان فی ردتهم و محاربتهم ضرر علی الاسلام لما عندهم من العز و المنعة، فرای الامام ان یرضخ لهم من الصدقة فعل ذالك لخلال ثلاث: احدا هن الاخذ بالکتاب و السنة و الثانیة البقیا علی المسلمین، و الثالثة انه لیس بیایس منهم ان تمادی بهم الاسلام ان یفقهوه و تحسن فیهم رغبتهم.
(کتاب الاموال ۶۰۷)

تو انھوں نے یہ پیش نظر رکھ کر کہا ہے کہ یہ حکم ہمیشہ باقی رہے گا۔ اور یہی قول ہمارا بھی ہے، کیونکہ یہ آیت محکم ہے، قرآن یا سنت سے اس کے منسوخ ہونے کا کوئی ثبوت ہمارے علم میں نہیں ہے۔ جب ایسے لوگ موجود ہوں جن کا اسلام کی طرف میلان صرف مال کے لیے ہو اور ان کے ارتداد یا ان سے جنگ کی صورت میں بھی ان کی طاقت وقوت کے سبب سے اسلام کے لیے خطرہ ہو تو ایسی صورت میں اگر اسلامی حکومت صدقہ کی مد سے ان کی دل جوئی کرے تو تین وجوہ سے وہ ایسا کر سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ ایسا کر کے کتاب وسنت کے ایک حکم کی تعمیل کرے گی، دوسری یہ کہ اس میں مسلمانوں کی ہمدردی ہے، تیسری یہ کہ وہ یہ توقع کر سکتی ہے کہ اگر ان لوگوں کو کچھ عرصہ اسی طرح اسلام پر قائم رکھا جا سکا تو کیا عجب وہ اسلام کو سمجھنے لگ جائیں اور دل سے اس کو قبول کر لیں۔"

یہی نقطۂ نظر صاحب "نیل الاوطار" کا بھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

و الظاهر جواز التالیف عند الحاجة الیه. فاذا کان فی زمن الامام

"اور ظاہر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر ضرورت داعی ہو تو مال کے ذریعہ سے پرچانا

قوم لا يطيعونه الا للدنيا ولا يقدر على ادخالهم تحت طاعته بالقسر والغلب فله ان يتالفهم ولا يكون لفشو الاسلام تاثير لانه لم ينفع فی خصوص هذه الواقعة.

(نیل الاوطار ۴/۱۷۷)

جائز ہے۔ اگر حکومت اسلامی کو ایسے لوگوں سے سابقہ ہو جو مال کے بغیر اطاعت کرنے پر راضی نہ ہوں، اور جبر وزور کے ذریعہ سے ان کو زیر اطاعت لانے کی قدرت نہ ہو تو اس کے لیے یہ جائز ہے کہ مال کے ذریعہ سے ان کی تالیف قلب کرے۔ اور اسلام کے غلبہ کا اس امر پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، کیونکہ مذکورہ صورت میں تو صاف واضح ہے کہ وہ کچھ موثر ثابت نہیں ہوا۔''

یہی رائے علامہ ابن حزم نے ''المحلّٰی'' میں ظاہر کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

وادعى قوم ان سهم المولفة قلوبهم قد سقط. قال ابو محمد وهذا باطل، بل هم اليوم اكثر ما كانوا وانما يسقطون هم والعاملون اذا تولى المرء قسمة صدقة نفسه لانه ليس هنالك عاملون عليها، وامر المولفة الى الامام لا الى غيره. (المحلّٰی ۶/۱۴۵)

''اور ایک گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب کی مد ساقط ہو چکی ہے۔ اور ابو محمد (ابن حزم) کا کہنا یہ ہے کہ آج وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ موجود ہیں۔ مؤلفۃ القلوب اور عاملین کی مدیں تو اس وقت ساقط ہوں گی جب ہر شخص اپنے اپنے صدقہ وزکوٰۃ کی تقسیم کی ذمہ داری خود سنبھال لے، کیونکہ اس صورت میں عاملین سرے سے ہوں گے ہی نہیں اور مؤلفۃ القلوب کا معاملہ تمام تر اسلامی حکومت سے متعلق ہے، افراد سے اس کا تعلق ہی نہیں ہے۔''

ان اقوال سے صاف ظاہر ہے کہ مؤلفۃ القلوب کی مد جس طرح پہلے ضروری تھی، اسی طرح اب بھی ضروری ہے اور اس مد پر زکوٰۃ کی مد سے خرچ کیا جا سکتا ہے۔

البتہ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جس طرح ایک اسلامی حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ صدقات اور زکوٰۃ کی آمدنی سے اس خالص پولیٹیکل مقصد پر خرچ کرے، اسلامی حکومت کی عدم موجودگی میں دینی اداروں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے اس کو صرف کریں؟ اس بارہ میں میرا رجحان یہ ہے کہ یہ ایک پولیٹیکل خرچ ہے جس کی ذمہ داریوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہونا ایک حکومت ہی کے لیے ممکن ہے۔ اس وجہ سے پبلک اداروں اور انجمنوں کو اپنے تصرفات اسی حد تک محدود رکھنے چاہییں جس حد تک محدود رکھنے کا انھوں نے اظہار و اعلان کیا ہے اور جس دائرہ کے اندر خرچ کرنے کے لیے زکوٰۃ ادا کرنے والوں نے ان پر اعتماد کیا ہے۔ صرف بعض صورتیں اس سے مستثنیٰ کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً اگر کسی جگہ کے مسلمان بالکل کفر اور اہل کفر کے زیر اثر آ گئے ہوں اور وہ محسوس کرتے ہوں کہ مال خرچ کر کے بعض مسلمانوں کو کفر کے لیے استعمال ہونے سے بچایا جا سکتا ہے یا اس کے ذریعہ سے مخالفین کو اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی سے روکا جا سکتا ہے تو اس مقصد کے لیے زکوٰۃ کے مال میں سے بھی وہ خرچ کر سکتے ہیں۔

۴۔ فی الرقاب

'فی الرقاب' سے مطلب یہ ہے کہ غلاموں کے آزاد کرنے پر بھی زکوٰۃ کی مد سے خرچ کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اب غلامی کا مسئلہ ختم ہو چکا ہے، لیکن قرآن کے نزول کے وقت یہ مسئلہ موجود تھا اس وجہ سے ایک اہم انسانی خدمت کے پہلو سے ان کی اعانت اور ان کی آزادی کو بھی زکوٰۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف قرار دیا گیا۔

اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ اس سے مراد ہر طرح کے غلام ہیں یا صرف وہ غلام مراد ہیں جو اپنے آقاؤں سے ایک متعینہ رقم کی ادائیگی کی شرط پر اپنی آزادی کا اقرار حاصل کر لیتے ہیں، جن کو اصطلاح میں مکاتب کہتے ہیں۔ احناف اور شوافع کے نزدیک اس سے صرف مکاتب مراد ہیں۔ لیکن ابن عباس، حسن بصری، امام مالک، امام احمد بن حنبل، ابوثور، ابوعبید اور امام بخاری وغیرہ کے نزدیک یہ دونوں قسم کے غلاموں کے لیے عام ہے۔ ان کے نزدیک صدقات کی رقم سے ایک غلام کو

خرید کر آزاد کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ مکاتب کی اعانت کے مقابل میں اولیٰ وافضل ہے[۶]۔ لیکن احناف اور شوافع کے نزدیک صدقات کی مد سے مکاتب کی اعانت تو کی جاسکتی ہے، لیکن کسی غلام کو مستقلاً خرید کر آزاد نہیں کیا جاسکتا۔

مجھے اس معاملہ میں امام مالک اور امام احمد بن حنبل کا مذہب زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔ اول تو اس سبب سے کہ اس بحث میں سارا مدار سخن حرف لام پر ہے، تھوڑی دیر کے لیے مان لیجیے کہ وہ تملیک ہی کے مفہوم کے لیے خاص ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ 'الرقاب' پر وہ کہاں داخل ہے۔ یہاں سے تو اب 'فی' کا دخل شروع ہو جاتا ہے اور اس کے بعد جتنے مصارف بیان ہوئے ہیں، سب 'فی' ہی کے تحت ہیں۔ 'فی' کے متعلق یہ دعویٰ کوئی بھی نہیں کرسکتا کہ اس کے اندر بھی تملیک کے مفہوم کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہے۔ اس کے اندر تو جیسا کہ اوپر گزرا مصلحت، مفاد اور بہبود کا مفہوم پایا جاتا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ زکوٰۃ غلاموں کی بہبود اور ان کو آزاد کرنے کے لیے صرف کی جاسکتی ہے، قطع نظر اس سے کہ تملیک پائی جائے یا نہیں۔ ثانیاً، یہ کہ ہم مانے لیتے ہیں کہ تملیک کا مفہوم 'فی' کے اندر بھی گھسا ہوا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ہم ایک غلام کو اس کے مالک سے خرید کر آزاد کر دیتے ہیں تو اس میں تملیک کیوں نہیں پائی جاتی؟ اگر ایک مسکین کو زکوٰۃ کے پیسوں سے روٹی خرید کر دے دیں تو اس صورت میں تملیک پائی جائے گی یا نہیں۔ اسی طرح اگر ایک شخص کو ہم اس کی آزادی خرید کر اس کے حوالہ کر دیتے ہیں تو آخر اس میں تملیک کیوں نہیں پائی گئی؟ یہ ہم نے اس مفروضہ پر عرض کیا ہے کہ تملیک کا مفہوم 'فی' کے اندر بھی لے لیا جائے، لیکن ہمارے نزدیک، جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ صحیح نہیں ہے۔ 'فی' اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ صدقات وزکوٰۃ غلاموں کی بہبود اور ان کی آزادی کی مہم میں صرف کیے جاسکتے ہیں۔ اگر کوئی مکاتب اپنی مکاتبت کی رقم ادا کرنے کے لیے اعانت کا طالب ہے تو آپ اس کو بھی دے سکتے ہیں اور اگر آپ خود کسی غلام کو خرید کر اس کو آزاد کرنا چاہیں تو یہ بھی بے تکلف کر سکتے ہیں، بلکہ خدانخواستہ کسی جنگ کے نتیجہ کے

۶۔ نیل الاوطار ۴/ ۱۷۸۔

طور پر دنیا میں پھر غلامی کا مسئلہ ہو جائے اور خدمت انسانیت کے نصب العین کو سامنے رکھ کر ایسی انجمنیں قائم ہوں جو ان غلاموں کی آزادی اور ان کی سود و بہبود کے لیے وسیع پیمانہ پر تحریک چلائیں تو اس تحریک پر بھی صدقات و زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے میں کوئی مضایقہ نہیں ہونا چاہیے۔

ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ چونکہ مستقلاً کسی غلام کو آزاد کرنے کی صورت میں اس کا حق ولا اس کے آزاد کرنے والے کو حاصل ہوگا اور یہ خود اپنی زکوٰۃ سے ایک قسم کے انتفاع کی شکل ہوئی، اس وجہ سے اس کو ناجائز ہونا چاہیے، لیکن میرے نزدیک یہ شبہ کچھ وزنی نہیں ہے۔ اول تو یہ اعتراض اس صورت میں سرے سے وارد ہی نہیں ہوتا، جبکہ کوئی اسلامی حکومت یا پبلک ادارہ زکوٰۃ کے فنڈ سے کسی غلام کو خرید کر آزاد کرے، کیونکہ اس صورت میں اس آزاد کردہ غلام کا ولا عام مسلمانوں کو حاصل ہوگا جو شخصی انتفاع کے ہر شائبہ سے پاک ہے۔ ثانیاً، زکوٰۃ یا اس طرح کی کسی چیز سے صرف وہ شخصی انتفاع ناجائز ہے جس کو پیش نظر رکھ کر ہی زکوٰۃ دی جائے یا وہ کام کیا جائے۔ لیکن اگر یہ صورت نہ ہو، بلکہ زکوٰۃ تو دی جائے اس کے اصل مقصد کو سامنے رکھ کر، لیکن اس کے نتیجہ میں زکوٰۃ دینے والے کو کوئی ضمنی فائدہ بھی حاصل ہو جائے تو اس کے سبب سے اس کا یہ کام ناجائز نہیں ہوگا۔ اگر ایک شخص حج اس لیے کرتا ہے کہ وہ عرب کی سیاحت کرنا چاہتا ہے تو اس کا حج بلاشبہ نہیں ہوگا، لیکن اگر وہ حج، حج کے ارادہ سے کرتا ہے اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اسے حجاز کی سیاحت کا بھی موقع مل جاتا ہے تو آخر اس سے اس کا حج کیوں باطل ہو جائے گا؟

۵۔ غارمین

زکوٰۃ و صدقات کا مال غارمین کی امداد میں بھی خرچ کیا جا سکتا ہے۔ غارمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی کاروباری اتار چڑھاؤ یا حالات کی نامساعدت کے سبب سے قرضے کے نیچے دب گئے ہوں۔ یا کسی آفت ارضی و سماوی، سیلاب یا قحط نے ان کے گلہ یا باغ یا کھیتی یا سرمایہ یا مکانات یا کاروبار کو تباہ کر دیا ہو یا انھوں نے اصلاح ذات البین کے ارادہ سے دوسروں کی کوئی مالی ذمہ داری

اپنے سر لے لی ہو۔

اس طرح کے لوگوں کی امداد اس نقطۂ نظر سے کی جائے گی کہ یہ معاشرہ کے کماؤ اور قابل افراد ہیں، ان کو گرنے اور تباہ ہونے سے بچایا جائے تاکہ یہ جس چکر میں آ گئے ہیں، اس سے نکل کر پھر اپنی صلاحیتوں سے قوم اور معاشرہ کو بہرہ مند کرسکیں۔ ان کی امداد ان کے فقر یا ان کی مسکنت کی بنا پر نہیں کی جائے گی۔ اگر اس بنا پر کی جاتی ہوتی تو ان کا ذکر ایک مستقل عنوان سے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ پھر تو یہ فقرا اور مساکین کے زمرہ میں آپ سے آپ آ جاتے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کی احتیاج کے ناپنے کا پیمانہ اس سے بالکل مختلف ہوگا جو فقرا اور مساکین کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے دلائل ملاحظہ ہوں:

كتب عمر بن عبدالعزيز ان اقضوا عن الغارمين فكتب اليه انا نجد الرجل له المسكن، والخادم والفرس والاثاث فكتب عمر انه لا بد للمرء المسلم من مسكن يسكنه، وخادم يكفيه مهنته، وفرس يجاهد عليه عدوه ومن ان يكون له الاثاث فی بيته. نعم فاقضوا عنه. (کتاب الاموال ۵۵۶)

''حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عمال کو یہ فرمان لکھا کہ زیر باروں (غارمین) کے قرضے ادا کیے جائیں۔ ان کے عمال کی جانب سے ان کو یہ اطلاع دی گئی کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس مکان موجود ہے، نوکر موجود ہے، گھوڑا موجود ہے، گھر میں فرنیچر اور اثاثہ موجود ہے۔ کیا ایسے لوگوں کے قرضے بھی اتارے جائیں؟ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب میں لکھا کہ ایک مسلمان کے لیے ایک مکان جس میں وہ رہ سکے، ایک نوکر جو اس کا ہاتھ بٹا سکے، ایک گھوڑا جس پر وہ اپنے دشمن سے مقابلہ کر سکے اور گھر میں کچھ سروسامان تو ناگزیر چیزیں ہیں۔ اس وجہ سے میں کہتا

ہوں کہ ہاں، ان لوگوں کے قرضے بھی ادا کرو۔''

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عمال کو یہ شبہ ہوا تھا کہ غارمین جب تک فقر کی اس حد کو نہ پہنچ جائیں جو فقرا و مساکین کے لیے مقرر ہے، اس وقت تک صدقات کی مد سے ان کے قرضے یا ان کی ذمہ داریاں نہیں ادا کی جا سکتی ہیں، لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے جواب سے یہ بات صاف کر دی کہ اس طبقہ کا صرف فقر دور کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ اس کو اٹھانا مقصود ہے۔ اس وجہ سے اس کی احتیاج کو اس پیمانہ سے نہ ناپو جس پیمانہ سے فقرا و مساکین کی احتیاج کو ناپتے ہو۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد معدلت گستر میں اپنے عمال کو یہ حکم دیا تھا کہ:

اعطوا من الصدقة من ابقت له السنة غنما ولا تعطوها من ابقت له السنة غنمين.

''صدقہ کے مال سے ان کی مدد کرو جن کا قحط سے صرف ایک ریوڑ بچ رہا ہو۔ ان کی مدد نہ کرو جن کے پاس دو ریوڑ بچ رہے ہوں۔''

(کتاب الاموال ۱/۶۶۹)

روایت میں لفظ 'غنم' کا ہے۔ 'غنم' سے مراد بکریوں کا ایک ریوڑ ہوتا ہے جو کم وبیش سو بکریوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سو بکریاں اس حد احتیاج سے بہت زیادہ ہیں جن میں آدمی زکوٰۃ کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اتنی بکریوں کی موجودگی میں تو اس سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، لیکن اگر قحط یا سیلاب یا کسی دوسری آفت کے سبب سے کسی کا گلہ یا اس کے مویشی تباہ ہو جائیں اور اس کے پاس صرف سو بکریاں بچ رہیں تو وہ بحیثیت ایک غارم کے مستحق ہے کہ حکومت اسلامی صدقات کے فنڈ سے اس کو سہارا دے تاکہ وہ اپنے کاروبار کو سنبھالے رکھ سکے۔

جو شخص محض اس بنا پر غارم کے حکم میں آ جاتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کے آپس کے کسی جھگڑے کو چکانے کی خاطر کوئی مالی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے تو اس کی غربت و امارت کا تو کوئی سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک صاحب مال ہوتے ہوئے بھی ایک غارم ہے اور

مستحق ہے کہ اپنی اٹھائی ہوئی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صدقات وزکوٰۃ سے امداد پائے۔ امام شوکانی لکھتے ہیں:

''اہل عرب کا حال یہ تھا کہ جب ان کے درمیان کوئی ایسا جھگڑا برپا ہوتا جو دیت وغیرہ کی قسم کے کسی مالی مطالبہ پر مبنی ہوتا تو کوئی شخص اٹھتا اور جھگڑے کو چکانے کے لیے محض للہ فی اللہ اس ذمہ داری کو اپنے سر لے لیتا اور جھگڑا ختم ہو جاتا۔ یہ چیز مکارم اخلاق میں شامل ہے۔ جب لوگوں کو پتا چلتا کہ کسی شخص نے اس طرح کی کوئی ذمہ داری اٹھالی ہے تو اس کی امداد کے لیے سبقت کرتے، یہاں تک کہ وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا۔ اور اگر اس مقصد کی خاطر اس کو لوگوں سے سوال کرنے کی نوبت آتی تو یہ چیز اس کی عزت میں کوئی کمی نہ کرتی، بلکہ اس کے لیے وجہ فخر ہوتی۔'' (نیل الاوطار ۴/۱۷۹)

بس ایک چیز اس میں دیکھنے کی ہے، وہ یہ کہ ایک شخص فی الواقع کسی ارضی وسماوی آفت یا کسی واقعی اتار چڑھاؤ کی زد میں آ کر زیر بار ہوا ہے یا محض اپنی مشیخت اور اپنے اسراف یا اپنے شوق قسمت آزمائی کا شکار ہوا ہے۔ اگر پہلی صورت ہے تو وہ غارم ہے اور زکوٰۃ کے فنڈ سے مدد پانے کا مستحق، لیکن اگر دوسری صورت ہو تو اس کی حوصلہ افزائی کم از کم زکوٰۃ وصدقات کی مد سے نہیں کرنی چاہیے۔ ورنہ یہ چیز بہتوں کو غلط راہ پر ڈال دے گی۔

۶۔ فی سبیل اللہ

فی سبیل اللہ ایک وسیع مفہوم رکھنے والی اصطلاح ہے جس کے اندر نیکی اور بھلائی کے وہ سارے کام داخل ہیں جن کی طرف اللہ اور اس کے رسول نے رہنمائی فرمائی ہے۔ اس کے مقابل اصطلاح فی سبیل الطاغوت ہے جس سے مراد وہ پورا نظام ضلالت ہے جو شیطان نے بچھا رکھا ہے۔ اس تقابل کی روشنی میں غور کیجیے تو یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد وہ پورا نظام ہدایت بحیثیت مجموعی بھی ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اور اس کے الگ الگ اجزا بھی اس سے مراد ہو سکتے ہیں۔ اگر بحیثیت مجموعی اس پورے نظام کے قیام و بقا اور اس کے استحکام

پر صدقات و زکوٰۃ کی مد سے خرچ کیا جائے جب بھی کوئی مضایقہ نہیں ہے۔ اور اگر اس کے کسی ایک ہی جز کی حفاظت و ترقی پر اس کو صرف کیجیے جب بھی وہ فی سبیل اللہ ہے۔

انفاق اور جہاد بالمال کے تعلق کے ساتھ جہاں جہاں فی سبیل اللہ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے، ہم اس کی بعض مثالیں یہاں قرآن مجید سے نقل کرتے ہیں تا کہ کچھ اندازہ ہو سکے کہ اس اصطلاح کے تحت کیا کیا چیزیں آسکتی ہیں:

وَاَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ. (البقرہ۲:۱۹۵)	”اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔“

یہاں فی سبیل اللہ سے مراد جہاد بالسیف ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت اور خانہ کعبہ کو کفار کے پنجہ سے چھڑانے کے لیے جاری تھا:

مَثَلُ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنۡبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ. (البقرہ۲:۲۶۱)	”ان لوگوں کے خرچ کی مثال جو اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ایسی ہے جیسے ایک دانہ اُگائے سات بالیاں۔“

یہاں فی سبیل اللہ سے مراد عام مصارف خیر ہیں جن میں نیکی اور بھلائی کے سارے کام داخل ہیں:

اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ثُمَّ لَا یُتۡبِعُوۡنَ مَاۤ اَنۡفَقُوۡا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًی. (البقرہ۲:۲۶۲)	”جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنا مال اللہ کے راستہ میں اور اس خرچ کے پیچھے اظہار احسان اور ایذا کی بلا نہیں لگا دیتے۔“

مذکورہ آیت میں بھی فی سبیل اللہ سے فقرا اور مساکین اور اس طرح کے دوسرے مستحقین مراد ہیں:

لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِیۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِی الۡاَرۡضِ. (البقرہ۲:۲۷۳)	”ان فقرا کے لیے خرچ کیا جائے جو اللہ کی راہ میں بندھ گئے ہیں اور زمین میں ہاتھ پاؤں نہیں مار سکتے۔“

اس آیت میں سیاق کلام سے واضح ہے کہ فی سبیل اللہ سے دین اور علم دین مراد ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَھُمۡ لِیَصُدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ. (الانفال ۸:۳۶)	''جن لوگوں نے کفر کیا، وہ اپنا مال اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکیں۔''

یہاں سبیل اللہ سے مراد اسلام بحیثیت مجموعی ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَھَاجَرُوۡا وَ جٰھَدُوۡا بِاَمۡوَالِھِمۡ وَاَنۡفُسِھِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ. (الانفال ۸:۷۲)	''بے شک جو لوگ ایمان لائے، جنھوں نے ہجرت کی اور جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔''

یہاں فی سبیل اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ سے مراد اقامت دین کی جد و جہد بحیثیت مجموعی ہے۔

اسی طرح ابوداؤد کی ایک روایت ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج بھی فی سبیل اللہ میں شامل ہے:'فان الحج من سبیل اللّٰہ'۔

مذکورہ بالا استعمالات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فی سبیل اللہ کے اندر نیکی اور خیر کے سارے ہی کام داخل ہیں۔ اگر یہ لفظ تنہا بولا جائے تو اس سے خیر کا کوئی خاص کام بھی مراد ہوسکتا ہے، اگر موقع کلام کسی خاص چیز کو متعین کردے۔ اور پورا دین بھی اس سے مراد ہوسکتا ہے، اگر موقع عمومیت کا ہو۔ اور اگر نیکی اور بھلائی کے چند متعین کاموں کے ساتھ اس کا ذکر آئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان خاص خاص کاموں کے بعد اس جامع اصطلاح نے بقیہ دوسرے دین کے سارے کاموں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ یہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، بعینہٖ یہی بات دوسرے محقق علما نے بھی لکھی ہے۔

علامہ آلوسی حنفی اپنی تفسیر ''روح المعانی'' میں فی سبیل اللہ کی تفسیر کے تحت حنفیہ کا مسلک نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قیل المراد طلبة العلم و اقتصر علیه فی الفتاوی الظھیریه و فسره فی	''کہا گیا ہے کہ اس سے مراد طالب علم ہیں اور ''فتاویٰ ظہیریہ'' میں اس مد کو طلبہ ہی تک

البدائع بجمیع القرب فیدخل فیه کل من سعی فی طاعة اللّٰہ تعالٰی و سبل الخیرات.

(روح المعانی ۱۰/ ۱۲۳)

محدود کر دیا گیا ہے، لیکن ''بدائع الصنائع'' میں اس کی تفسیر یوں کی گئی ہے کہ اس میں نیکی اور قرب الٰہی کے سارے ہی کام داخل ہیں تو جو شخص بھی اللہ کی اطاعت اور بھلائی کے کاموں میں جدوجہد کرے گا، وہ اس میں شامل ہوگا۔''

ابن عربی ''احکام القرآن'' میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال مالك سبل اللّٰہ کثیرة.... احمد و اسحٰق فانهما قالا انه الحج و الذی یصح عندی من قولهما ان الحج من جملة السبل مع الغزو. (۹۶۹/۲)

''فی سبیل اللہ کے متعلق امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ اللہ کے راستے بہت سے ہیں۔ امام احمد اور اسحٰق کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد حج ہے، لیکن میرے نزدیک ان کے قول کا صحیح منشا یہ ہے کہ حج بھی جہاد کی طرح اللہ کے راستوں میں سے ایک راستہ ہے۔''

''تفسیر کبیر'' اور ''تفسیر خازن'' میں فی سبیل اللہ کے تحت یہ قول ملاحظہ فرمایئے:

واعلم ان ظاهر اللفظ فی قوله وفی سبیل اللّٰہ لا یوجب القصر علی کل الغزاة فلهذا المعنی نقل القفال فی تفسیره عن بعض الفقهاء انهم اجازوا صرف الصدقات الی جمیع وجوه الخیر من تکفین الموتٰی و بناء الحصون وعمارة المساجد لان قوله

''فی سبیل اللہ کے ظاہر الفاظ اس بات کو لازم نہیں کرتے کہ اس مد کو تمام تر مجاہدین کے لیے خاص کر دیا جائے۔ اسی وجہ سے قفال نے اپنی تفسیر میں بعض فقہا کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ وہ صدقات کو تمام مصارف خیر، مثلاً مردوں کی تجہیز و تکفین، قلعوں کی تعمیر، مساجد کی تعمیر پر خرچ کرنا جائز قرار دیتے ہیں، کیونکہ فی سبیل اللہ کے الفاظ ان

وفی سبیل اللّٰه عام فی الکل. تمام چیزوں پر حاوی ہیں۔“

(التفسیر کبیر ۸۷/۶؛ تفسیر خازن ۳۰۷/۲)

علامہ ابن حزم ”المحلّٰی“ میں فی سبیل اللہ کے تحت یہ فرماتے ہیں:

فلنا نعم و کل فعل خیر فھو من سبیل اللّٰه تعالٰی. (۱۵۱/۴) ”ہم کہتے ہیں ہاں، نیکی اور بھلائی کا ہر کام فی سبیل اللہ کے تحت داخل ہے۔“

اس دور آخر کے مشہور سلفی عالم علامہ رشید رضا مرحوم اپنی ”تفسیر المنار“ میں فی سبیل اللہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

و فی سبیل اللّٰه وھو یشمل سائر المصالح الشرعیة العامة التی ھی ملاك امر الدین والدولة واولھا واولاھا بالتقدیم الاستعداد للحرب بشراء السلاح واغذیة الجندوادوات النقل و تجھیز الغزاة وتقدم مثله عن محمد بن عبد الحکم.

”فی سبیل اللہ کے الفاظ ان تمام شرعی مصالح پر مشتمل ہیں جن پر مذہب اور حکومت کا انحصار ہے۔ ان میں سب سے اول اور سب پر مقدم یہ ہے کہ جنگ کی تیاری کے لیے اسلحہ خریدے جائیں، فوج کے لیے غذائی سامان فراہم کیا جائے، ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا جائے، مجاہدین کو سامان حرب سے لیس کیا جائے۔ اسی طرح کا قول محمد بن حکم سے مروی ہے۔“

(تفسیر المنار ۵۰۵/۱۰۔۵۰۶)

ہمارے ملک کے بلند پایہ عالم مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم اپنی شہرۂ آفاق کتاب ”سیرۃ النبی“ میں فی سبیل اللہ کے متعلق اپنی رائے لکھتے ہیں:

”فی سبیل اللہ کا وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے نیک کاموں کو شامل ہے۔“ (۱۷۶/۵)

مذکورہ بالا اقوال سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فی سبیل اللہ کی مد ایک وسیع مد ہے۔ اس میں نیکی اور بھلائی کے سارے ہی کام داخل ہیں۔ اسلام کی دینی و دنیاوی مصلحت کی کوئی بات بھی ایسی نہیں رہ گئی ہے جو اس کے اندر سمٹ نہ آئی ہو۔ اس میں کسی پہلو سے تملیک کا بھی کوئی سوال نہیں

پیدا ہوتا، کیونکہ اول تو یہاں کوئی چیز ایسی ہے نہیں جس سے تملیک کا مفہوم اخذ کیا جا سکے لے دے کر ایک ''لام'' تھا، لیکن اس کی جگہ پر بھی جیسا کہ عرض کیا گیا، یہاں 'فی' ہے جس کے اندر تملیک کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ ثانیاً، اگر اس کے تحت تمام تر مصارف خیر آتے ہیں، جیسا کہ ہر مسلک کے علما اور ائمہ نے تصریح کی ہے تو تملیک شخصی کا تو ان ساری صورتوں میں پایا جانا ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر ممکن ہے تو تملیک اجتماعی کا پایا جانا ممکن ہے اور اس سے ہمیں اختلاف نہیں ہے۔ پس اگر بالفرض کسی چیز کے جواز میں اس پہلو سے کسی کو تردد ہے کہ 'لِلۡفُقَرَآءِ' کی ''لام'' کے یہ منافی ہے تو اس کو چھوڑیے، یہ دیکھیے کہ وہ فی سبیل اللہ کی مد کے تحت آتی ہے یا نہیں؟ اگر آتی ہے تو اس کے جواز کی یہ دلیل کافی ہے۔

۷۔ ابن السبیل

ابن السبیل سے مراد مسافر ہے۔ مسافرت بجائے خود ایک ایسی حالت ہے جو بجا طور پر آدمی کو مدد کی محتاج اور مستحق بنا دیتی ہے۔ ایک اوسط درجہ کا آدمی بھی جو اپنے شہر میں ایک کھاتا پیتا آدمی شمار ہوتا ہے، اگر کسی سفر پر مجبور ہو جائے تو اس کے لیے یہ ممکن نہیں رہ جاتا کہ ہر جگہ اپنی ساری ضروریات خود پوری کر سکے۔ یہ تو صرف تھوڑے سے مال داروں ہی کے لیے ممکن ہے کہ وہ جہاں بھی جائیں اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں میں ٹھیریں، ٹیکسیوں میں گشت کریں اور اگر بیمار پڑ جائیں تو اپنے مستقر ہی پر ڈاکٹر بلا کر علاج کرائیں۔ ایک عام آدمی، اگرچہ وہ محتاج اور فقیر کی تعریف میں نہ آتا ہو، سفر میں اپنی ساری ضروریات اگر خود اپنی جیب کے بل پر پوری کرنی چاہے تو یہ اس کے لیے ناممکن ہوگا۔ وہ تو بہرحال مجبور ہوگا کہ اگر رات گزارنی ہو تو کسی مسافر خانہ یا سرائے کا پتا معلوم کرے، اگر بیمار ہو جائے تو کسی خیراتی شفاخانہ میں داخل ہونے کی کوشش کرے اور اگر ٹرانسپورٹ کا کوئی رعایتی یا مفت ذریعہ ہاتھ آ جائے تو اس سے فائدہ اٹھائے۔ اگر وہ یہ کچھ نہ کرے گا تو اس کے لیے کسی لمبے سفر کے مصارف کا بار اٹھانا ناممکن ہو جائے گا۔ اس وجہ سے

شریعت نے اس کو عام معنوں میں محتاج نہ ہونے کے باوجود صدقات وزکوٰۃ سے فائدہ اٹھانے کا حق دیا ہے۔ابن کثیر نے ابوداؤد کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا تحل الصدقة لغنی الا فی سبیل اللّٰہ اوابن السبیل او جار فقیر فیھدی لك او یدعوك. (تفسیر القرآن العظیم ۲/۳٦٦)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی غنی کے لیے صدقہ جائز نہیں ہے، مگر تین صورتوں میں: وہ اللہ کی راہ میں ہو یا مسافر ہو یا کوئی غریب پڑوسی ہو جو صدقہ کے مال میں سے تمھارے لیے ہدیہ بھیجے یا کھانے پر بلائے۔''

اس وجہ سے یہ بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ صرف ان ہی مسافروں کو صدقات سے استفادہ کا مستحق سمجھا جائے جن کا کرایہ کھڑ گیا ہو یا جن کا اونٹ مر گیا ہو، بلکہ عام مسافروں کو بھی اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے، بلکہ تملیک شخصی کی پابندی نہ باقی رہنے کی صورت میں تو بہتر شکل مسافروں کو فائدہ پہنچانے کی یہ ہے کہ تمام ایسی مرکزی جگھوں پر جہاں ہر طبقہ کے مسلمان جمع ہونے پر مجبور ہوتے ہوں اور تمام ایسے شہروں میں جن میں عموماً باہر کے مسلمان آمدورفت رکھتے ہوں، مسافروں کی سہولت اور آسایش کے لیے مسافر خانے اور رباطیں بنائی جائیں، جہاں اس امر کا بھی اہتمام ہو کہ ان کے پیش نظر مقصد کے لحاظ سے ضروری معلومات فراہم کی جاسکیں، ان کی ڈاک اور تار کا اہتمام ہو اور ضرورت کے مطابق ان کے لیے طبی امداد بھی بہم پہنچ سکے۔مکہ، مدینہ، منیٰ اور جدہ میں جتنی اس کی ضرورت ہے، اس سے قطع نظر کیا کراچی، لاہور، پشاور اور اس طرح کے دوسرے شہروں میں مسافروں کے لیے اس طرح کی سہولتیں فراہم کرنے کی شدید ضرورت نہیں ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مسافر بسا اوقات اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے دھکے کھاتے پھرتے ہیں، لیکن ہمارے کسی شہر میں بھی ایسے ادارے موجود نہیں ہیں جو مسافروں کو ان کی مطلوبہ سہولتیں بہم پہنچانے کے ذمہ دار ہوں۔

ابوعبید نے ''کتاب الاموال'' میں انس بن مالک اور حسن بصری کا ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے

کہ:

قالا ما اعطیت فی الجسور والطرق فھی صدقة ماضیة. (کتاب الاموال ۵۷۴)	''ان دونوں کا یہ قول ہے کہ پلوں اور راستوں کی تعمیر میں جو کچھ تم نے دیا، وہ بھی صدقہ اداشدہ ہے۔''

ممکن ہے کہ ان بزرگوں نے اس کو فی سبیل اللہ کے تحت داخل کیا ہو، لیکن بالکل مساوی ہی درجہ کا ایک امکان یہ بھی ہے کہ وہ اس کو ابن السبیل کے تحت لائے ہوں۔

قربانی کی کھالوں کا شرعی حکم

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے، وہ صدقات وزکوٰۃ کی معروف اقسام کو پیش نظر رکھ کر عرض کیا گیا ہے، لیکن خاص قربانی کی کھالوں سے متعلق ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ کیا ان کی نوعیت بعینہ وہی ہے جو عام صدقات وزکوٰۃ کی ہے یا ان سے کچھ مختلف ہے؟ بعض واضح دلائل کی بنا پر اس عاجز کا رجحان یہ ہے کہ ان کی نوعیت صدقات وزکوٰۃ کی معروف اقسام سے بالکل مختلف ہے۔

اس اختلاف کی ایک واضح دلیل تو یہ ہے کہ زکوٰۃ کی عام طور پر جو تعریف کی جاتی ہے، اس کا کوئی جز بھی اس کے اوپر صادق نہیں آتا۔

زکوٰۃ کی تعریف عام طور پر یہ کی جاتی ہے:

''نصاب مقررہ کا کوئی حصہ کسی فقیر یا اس طرح کے کسی ایسے آدمی کو دینا جس کو دیے جانے میں کوئی شرعی مانع موجود نہ ہو اور یہ دینا اس طرح ہو کہ عطا کردہ مال سے دینے والے کا کوئی مفاد وابستہ نہ رہے۔''

اب آیئے دیکھیے کہ اس کا کوئی جز بھی قربانی کی کھالوں پر صادق آتا ہے؟

قربانی کی کھالیں نصاب کا کوئی جز نہیں ہیں۔

ان کو لازماً کسی فقیر ہی کو دینا ضروری نہیں ہے، آپ خود بھی اپنی قربانی کی کھال اپنے کسی ذاتی مصرف میں لا سکتے ہیں، اپنے کسی دوست کو دے سکتے ہیں، کسی غریب اور محتاج کو دے سکتے ہیں، بیچ کر اس کی قیمت صدقہ کر سکتے ہیں، بس اگر ممانعت ہے تو اس بات کی کہ بیچ کر اس کے دام کھرے کرنے کی فکر نہ کیجیے۔

اس کے دینے میں کسی ہاشمی یا غیر ہاشمی کے امتیاز کی کوئی وجہ بھی بظاہر نظر نہیں آتی، کیونکہ اس کے اوپر ''لوگوں کے مال کا میل'' ہونے کی تعبیر کسی طرح بھی صادق نہیں آتی۔ دینے والے کا اپنا مفاد بھی اس سے منقطع ہونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص اپنی قربانی کی کھال کی جانماز بنا کر محلّہ کی مسجد پر وقف کر دے تو اس پر وہ خود بھی نماز پڑھ سکتا ہے اور دوسرے مسلمان بھی اس پر نماز پڑھ سکتے ہیں۔

اب میں مختصراً قرآن وحدیث اور فقہ کی کتابوں سے مذکورہ باتوں کی دلیلیں نقل کرتا ہوں۔

جہاں تک قربانی کے گوشت کا تعلق ہے، اس کا ذکر تو خود قرآن ہی میں موجود ہے کہ اس کو کھاؤ، کھلاؤ اور غریبوں کو دو:

فَكُلُوا مِنهَا وَاَطعِمُوا البَآئِسَ الفَقِيرَ . ''پھر اس میں سے خود بھی کھاؤ اور مصیبت زدہ فقیر کو بھی کھلاؤ۔''
(الحج ۲۲:۲۸)

اس آیت میں خصوصیت کے ساتھ یہ نکتہ ملحوظ رکھنے کا ہے کہ اس میں فقیر کو دینے کا ذکر 'اٰتُوا' یا 'تَصَدَّقُوا' کے الفاظ کے ساتھ نہیں آیا ہے، بلکہ 'اَطعِمُوا' کے لفظ کے ساتھ آیا ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض کر لیا جائے کہ 'ایتاء' اور 'تصدق' کے الفاظ تملیک شخصی کے مفہوم کے لیے آتے ہیں، جیسا کہ دعویٰ کیا جاتا ہے تو کیا 'اطعام' کا لفظ بھی تملیک شخصی کے مفہوم کا حامل ہے؟ اگر ایک شخص اپنا قربانی کا گوشت پکا کر بہت سے غریبوں کو بلا کر ایک دعوت عام کی صورت میں کھلا دے تو کیا یہ اطعام نہ ہوگا؟ حالانکہ ''فتح القدیر'' کی تصریح کے مطابق اس صورت میں تملیک نہیں پائی گئی جس کو صدقات وزکوٰۃ کی شرط لازم قرار دیا گیا ہے۔

جو حکم قربانی کے گوشت کا ہے، احادیث اور فقہا کی تصریحات سے ثابت ہے کہ بعینہٖ وہی حکم

قربانی کی کھالوں کا بھی ہے، یعنی ایک شخص اپنی قربانی کی کھال خود اپنے کسی ذاتی مصرف میں بھی لاسکتا ہے، کسی کو ہبہ بھی کرسکتا ہے اور کسی محتاج اور غریب کو صدقہ بھی کرسکتا ہے۔ پس یہ بات ناجائز ہے کہ خسیسوں اور لئیموں کی طرح اس کو سرمایہ بنانے کی کوشش کرے۔

حضرت قتادہ بن نعمان سے روایت ہے کہ:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قام فقال انی کنت امرتکم ان لا تاکلوا لحوم الا وضاحی فوق ثلاثة ایام لیسعکم. وانی احله لکم فکلوا ما شئتم ولا تبیعوا لحوم الھدی والاضاحی وکلوا وتصدقوا و استمتعوا بجلودھا ولا تبیعوھا. (نیل الاوطار ۱۳۷/۵)	''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور آپ نے خطبہ دیا کہ میں نے تم کو یہ حکم دیا تھا کہ قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ رکھ چھوڑا کرو، یہ حکم اس لیے دیا تھا کہ وہ تم سب کے لیے کافی ہوسکے۔ اب میں اس کو تمھارے لیے جائز کرتا ہوں۔ پس تم اس کو جس طرح چاہو برتو، البتہ نذر یا قربانی کا گوشت بیچو نہیں۔ کھاؤ، خیرات کرو اور ان کی کھالوں سے فائدہ اٹھاؤ، البتہ ان کو بیچو نہیں۔''

اس حدیث سے واضح ہے کہ قربانی کے گوشت اور اس کی کھال کے مصرف میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص چاہتا ہے تو اس کو اپنے کسی ذاتی مصرف میں بھی لاسکتا ہے، لیکن اس کو سرمایہ بنانے کا ذریعہ نہ بنائے، بلکہ اس کو صدقہ کردے۔

فقہا کی تصریحات بھی اس کے متعلق یہی ہیں۔

امام شوکانی مذکورہ حدیث کے تحت فرماتے ہیں:

وفیه ایضا الاذن بالانتفاع بھا بغیر البیع وقد روی عن محمد بن الحسن ان له ان یشتری	''اور اس حدیث سے بیچے بغیر ان کھالوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نکلتی ہے۔ محمد بن حسن سے مروی ہے کہ اس کھال کے

بمسكها غربا لا او غيرها من آلة البيت لا شيئا من الماكول وقال الثورى لا يبيعه ولكن يجعله سقا و شنا فى البيت.
(نیل الاوطار ۱۳۸/۵)

بدلہ میں آدمی گھر کے لیے چھلنی یا اس طرح کی گھریلو چیزوں میں سے کوئی چیز حاصل کر سکتا ہے، البتہ کھانے پینے کی کوئی چیز اس کے بدلہ میں نہ حاصل کرے۔ امام ثوری کہتے ہیں کہ اس کو بیچے نہیں، گھر کے لیے ڈول یا مشکیزہ بنالے۔"

حنفی فقہا کی تصریحات اس بارہ میں یہ ہیں:

ولما جاز الاكل منها دل على جواز الانتفاع بجلودها من غير جهة البيع ولذالك قال اصحابنا يجوز الانتفاع بجلد الاضحية وروى ذالك عن عمر وابن عباس وعائشة وقال الشعبى كان مسروق يتخذ مسك اضحيته مصلى ويصلى عليه.
(احکام القرآن، ابوبکر جصاص ۲۹۳/۳)

"جب قربانی کا گوشت کھانا جائز ہوا تو یہ بات اس کی دلیل ہے کہ اس کی کھالوں سے آدمی فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے، بشرطیکہ اس سے سرمایہ بنانے کی کوشش نہ کرے۔ اسی وجہ سے ہمارے علما کا مذہب یہ ہے کہ قربانی کی کھال سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ یہی بات حضرت عمر، حضرت ابن عباس، اور حضرت عائشہ سے بھی مروی ہے۔ شعبی کہتے ہیں کہ مسروق اپنی قربانی کی کھال کی جاے نماز بنا لیا کرتے اور اس پر نماز پڑھا کرتے۔"

غور فرمایئے کہ زکوٰۃ و صدقات کی تمام معروف اقسام میں سے ہے کوئی قسم ایسی جس میں آدمی کے لیے یہ سارے تصرفات جائز ہوں کہ وہ اس سے خود بھی فائدہ اٹھا سکے اور بلا امتیاز امیر و غریب، سید و غیر سید، کسی دوسرے کو بھی دے سکے اور اس کو صدقہ بھی کر سکے؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو آخر یہ بات کس طرح صحیح ہو سکتی ہے کہ وہ ساری شرطیں جو صدقات واجبہ کے لیے مقرر ہیں، وہ اس پر بھی لا کر چسپاں کر دی جائیں؟ ہم نے تھوڑی دیر کے لیے فرض کیا کہ تملیک

ادائیگی زکوٰۃ کے لیے رکن کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن کیا قربانی کی کھال زکوٰۃ اور صدقہ ہے کہ اس پر سارے احکام صدقہ اور زکوٰۃ کے عائد کیے جائیں؟

میں نے تو مذکورہ بالا احادیث واقوال کی روشنی میں جو کچھ سمجھا ہے، وہ یہ ہے کہ قربانی کے گوشت اور اس کی کھالوں کا معاملہ صدقات وزکوٰۃ کے سلسلہ سے تعلق رکھنے کے بجائے مکارم اخلاق، فیاضی اور احسان وتبرع سے تعلق رکھتا ہے، آدمی ان کو کھائے، کھلائے، خود برتے اور دوسروں کو ہدیے، تحفے اور صدقے کے طور پر دے۔ بس ان کو سینت کر رکھنے یا بیچ کر سرمایہ بنانے کی فکر نہ کرے۔ غربا اور محتاجوں کو اس میں سے پوری فیاضی کے ساتھ دے، بلکہ فضیلت یہی ہے کہ اگر خود ضرورت محسوس نہیں کرتا تو سب کچھ صدقہ کر دے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے:

عن علی ابن ابی طالب قال امرنی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ان اقوم علی بدنه وان اتصدق بلحومها وجلودها واجلتها. (سنن النسائی الکبریٰ، رقم ۴۱۴۵)

''حضرت علی ابن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ آپ کے قربانی کے اونٹوں کی قربانی کراؤں اور ان کے گوشت، ان کی کھالیں، یہاں تک کہ ان کے جھول سب صدقہ کر دوں۔''

اس کی نوعیت عام صدقات وزکوٰۃ کی نہیں ہے کہ آدمی خود کسی نوعیت سے بھی ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا یا ان کے اندر اس کا تصرف مخصوص قواعد وضوابط کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ وہ بلاشبہ اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اگر کسی انجمن یا ادارہ کی خدمات کو غربا کے لیے مفید پا رہا ہے تو اس کو بے تکلف دے سکتا ہے۔ اس میں کسی تملیک کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

آخر میں یہ گزارش ہے کہ یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، اپنے علم کی حد تک، میں نے صحیح دلائل سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ سب کچھ حرف حرف ٹھیک ہی ہے۔ اس وجہ سے میں یہ ذمہ داری کے خلاف سمجھتا ہوں کہ اس کو ایک حتمی اور قطعی

رائے کی حیثیت سے پیش کروں۔ یا اپنے منصب سے متجاوز ہو کر اس کو فتویٰ کی حیثیت دوں۔ بالخصوص جبکہ اس کا تعلق ایک ایسے مسئلہ سے ہے جس میں بعض قابل اعتماد لوگوں نے اس سے مختلف رائے قائم کی ہے جو میں نے قائم کی ہے۔ تاہم چونکہ میں اپنی رائے کو دلائل سے اپنے خیال میں مضبوط پا رہا ہوں، اس وجہ سے اس میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتا کہ اس کو فکر و نظر کے لیے اہل علم کے سامنے پیش کروں، ممکن ہے اس سے ایک اہم دینی مسئلہ پر غور کرنے کے لیے کچھ نئی راہیں کھلیں۔ پس جو اصحاب علمی دلائل کے ساتھ میری رائے کی کمزوریاں واضح کریں گے، میں ان کی رہنمائی کا خیر مقدم کروں گا اور ان کی ہر قوی بات شکریہ اور کشادہ دلی کے ساتھ قبول کروں گا۔

اللّٰھم ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه۔